اکتوبر ۲۰۱۷ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

دسمبر

مدیر ڈاکٹر محمد امین

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۱، شمارہ ۱۰، اکتوبر ۲۰۱۷ء/محرم الحرام ۱۴۳۹ھ

مشمولات

O صدائے حق

عقل تم کو ذرا نہیں آتی — پروفیسر طارق بٹ — ۴

O فہم دین

عصرِ حاضر میں تجدید واحیائے دین — ڈاکٹر محمد امین — ۵

O تعلیم و تحقیق

اسلامی تحقیق کے اصول (۲) — ڈاکٹر محمد رفیع الدینؒ — ۲۸

O اسلام اور پاکستان/ڈائیلاگ

- انتخابات پاکستان میں تحفظ اور غلبۂ دین کا ذریعہ ہیں — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۶
- شکر ہے لوگ نماز نہیں پڑھتے — پروفیسر عاصم حفیظ — ۴۵
- یورپ کا ''سہما ہوا مذہب'' اور قانونِ توہینِ رسالت — ۴۷

O اسلامی تحریکیں

دینی جدوجہد: نئی حکمت عملی کی ضرورت — ڈاکٹر انعام اللہ — ۵۰

O مطالعۂ کتاب

'اسلامی نظریاتی کونسل' ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی' — ڈاکٹر انوار بگوی — ۵۵

صدائے حق

پروفیسر طارق بٹ

عقل تم کو ذرا نہیں آتی
شرم تم کو مگر نہیں آتی

لاہور کے ضمنی انتخاب NA120 میں مسلم لیگ (ن) نے 61,745 ووٹ لیے اور پاکستان تحریک انصاف کی امیدوار نے 47,099 ووٹ لیے۔ جن دینی سیاسی جماعتوں نے اس میں حصہ لیا ان کے حاصل کردہ ووٹ یہ ہیں:

۱۔ جماعت اسلامی 592

۲۔ تحریک لبیک یارسول اللہ (بریلوی) 7,130

۳۔ جماعۃ الدعوۃ/ملی مسلم لیگ (اہل حدیث) 4,268

جمعیت علماء اسلام (سمیع الحق گروپ) اپنے امیدوار سے ناراض ہوگئی کیونکہ اس نے جماعۃ الدعوۃ کے امیدوار کی حمایت کردی جبکہ جمعیت علماء اسلام (فضل الرحمن)، پروفیسر ساجد میر کی مرکزی جمعیت اہل حدیث اور جمعیت علماء پاکستان (بریلوی) کے ایک گروپ نے مسلم لیگ (ن) کی حمایت کا اعلان کیا۔

دینی سیاسی جماعتوں کی یہ بے عزتی اور رسوائی کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوئی۔ یہ برسوں سے بار بار شکست کھا رہے ہیں لیکن کوئی سبق سیکھنے کو تیار نہیں۔ کوئی دین وشریعت کے لیے متحد ہونے کو تیار نہیں۔ کوئی اپنی مسلکی عصبیت ترک کرنے پر تیار نہیں۔ کوئی اپنی لیڈری چھوڑنے کو تیار نہیں۔ دین کی جگ ہنسائی ہوتی ہے تو ہوتی رہے، کچھ لیڈروں کی لیڈریاں چلتی رہنی چاہئیں، حلوے مانڈے کا کاروبار چلتے رہنا چاہیے۔ کہاں کا غلبۂ دین؟ کہاں کی نفاذ شریعت؟ اور کہاں کا نظام مصطفیٰ؟ رہے نام اللہ کا!

کوئی ہے جو دینی سیاسی جماعتوں کی مسلسل شکستوں پر غور کرے؟ کوئی دینی سیاسی جماعت ہے جو اپنی اس شرمناک شکست پر غور کرے اور اس کا علاج سوچے؟ سچ ہے جس گھر سے اخلاص اور فراست رخصت ہو جائیں وہاں ادبار اور زوال خود بخود داخل ہو جاتا ہے۔

فہم دین

ڈاکٹر محمد امین

عصرِ حاضر میں تجدید واحیائے دین

اجتہاد، تجدید، جہاد اور تجدد، بدعت ودین کی نئی تعبیر میں فرق اور ان کی شرعی حیثیت

پاکستانی مسلمانوں کے دینی واخلاقی تنزل کے پیش نظر ہم ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ ماضیٔ قریب کی تجدیدی واصلاحی کوششوں کا ایک تجزیاتی مطالعہ کیا جائے تاکہ پتہ چل سکے کہ کس حکمت عملی سے کیا دینی اہداف حاصل ہوئے اور کیا کچھ حاصل نہ کیا جاسکا۔ اور جو حاصل نہیں ہوسکا اس کے لیے کیا نئی حکمت عملی اختیار کی جائے۔ لیکن متعلقہ تحریکوں کے مطالعے سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ تجدید کے دائرہ کار کی کچھ وضاحت کردی جائے تاکہ متعلقہ مصطلحات کا مفہوم اور ان کا شرعی تناظر ذہن میں رہے اور بات کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

تجدید واحیائے دین کا دائرۂ کار

اس ضمن میں اسلامی روایت میں تین اصطلاحات مثبت پہلو سے استعمال ہوتی ہیں: اجتہاد، تجدید اور جہاد۔ اور تین اصطلاحات سلبی پہلو سے استعمال ہوتی ہیں: بدعت، تجدد اور دین کی نئی تعبیر۔ اس کے علاوہ وہ اصطلاحات ہیں جو دینی مفکرین یا دینی جماعتیں استعمال کرتی ہیں، ان کا ذکر ان مفکرین/ جماعتوں کے ذکر کے وقت زیر بحث آئے گا، ان شاء اللہ۔

اب ہم مذکورہ بالا اصطلاحات پر اتنی گفتگو کریں گے جن سے ان کا مفہوم اور ایک دوسرے سے فرق واضح ہوجائے۔

تجدید دین

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان مبارک ہے کہ:

[illegible] (۱)

یعنی اللہ تعالیٰ ہر صدی کے سرے پر میری امت میں ایک شخص بھیجے گا جو اس کے دین کی تجدید کرے گا۔

---

(۱) سنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۴۲۹۱

تجدید دین سے کیا مراد ہے؟ اس سے مراد ہے دین کو بدعات سے، حشو وزوائد سے اور ان امور، عادات اور رسوم ورواج سے پاک کرنا جن کی اصل دین میں موجود نہ ہو۔ یہاں تجدید دین کے دائرہ کار کو سمجھنے کے لیے بدعات ومحدثات کو سمجھنا ضروری ہے۔

بدعت

بدعت کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

[illegible] [1]

''محدثات (دین میں نئی باتوں) سے بچو کیونکہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہوتی ہے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

[illegible]

ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ [2]

''یعنی بدترین امور/ باتیں وہ ہوتی ہیں جو (دین میں) نئی ہوں اور ہر ایسی نئی بات گمراہی (کی موجب) ہوتی ہے اور ہر گمراہی کا نتیجہ جہنم ہے۔''

تجدد

بدعت کی مذمت کرنے کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی ماہیت بھی بیان فرمائی جس سے تجدد کی حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

[illegible] [3]

یعنی جس کسی نے ہمارے دین میں کوئی ایسی نئی چیز ایجاد کی جس کی اصل دین میں نہ ہو تو وہ مردود ہے۔

بدعت اور محدثات/تجدد کی ان تعریفات سے مندرجہ ذیل سوالات ذہن میں پیدا ہوتے ہیں:

---

[1] سنن ابی داؤد، بَابٌ فِي لُزُومِ السُّنَّةِ، رقم الحدیث: ۴۶۰۷، وصحیح مسلم، رقم الحدیث: ۴۲

[2] سنن النسائی، باب: کیف الخطبة، رقم الحدیث: ۱۵۷۸

[3] صحیح بخاری، بَابُ إِذَا اصْطَلَحُوا عَلَى صُلْحِ جَوْرٍ فَالصُّلْحُ مَرْدُودٌ، رقم الحدیث: ۲۶۹۷

۱۔ اجتہاد کا دائرہ کار کیا ہے؟ اجتہاد کو بدعات وتجدد سے کیسے ممیز کیا جا سکتا ہے؟

۲۔ دین کے نئے فہم یا نئی تعبیر کی گنجائش کتنی ہے؟ اور اس میں اجماع (اجماع صحابہ، اجماع مجتہدین، اجماع امت) اور جمہور علماء وجمہور امت یا مین اسٹریم اسلام کے موقف کا رول کیا ہے؟

۳۔ اسلام میں حریت فکر کی حدود کیا ہیں؟

۴۔ اسلام سے باہر کے افکار اور تہذیبوں سے استفادہ کس حد تک ممکن ہے؟

ہم ان سوالوں کے 'ان شاء اللہ' اطمینان بخش جوابات دیں گے تا کہ تجدید واحیائے دین کا تصور نکھر کر سامنے آ جائے لیکن اس سے پہلے ضروری محسوس ہوتا ہے کہ بدعات ومحدثات کے تصور پر کچھ مزید گفتگو کر لی جائے۔

بدعات ومحدثات کا مفہوم

مفہوم المخالفۃ کی رو سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی نئی بات ایسی ہو جس کی اصل دین میں موجود ہو تو وہ بدعت مذمومہ نہیں ہے۔ ''جس کی اصل دین میں موجود ہو'' سے مراد یہ ہے کہ یا تو وہ بات قرآن وسنت سے ماخوذ ومستنبط ہو یا مقاصد شریعت کے مطابق ہو۔ اس صورت میں یہ اجتہاد کی ایک نوع یا جزو ہو گی، جیسا کہ ہم آگے چل کر وضاحت کریں گے۔ اسے اصول فقہ میں 'سد الذریعۃ' کی طرح 'فتح الذریعۃ' سمجھا جا سکتا ہے لیکن ہمارے فقہاء نے 'سد الذریعۃ' کے قاعدے سے تو بہت کام لیا ہے لیکن 'فتح الذریعۃ' سے زیادہ کام نہیں لیا.... غالباً اس ڈر سے کہ اس کی حدود بدعت مذمومہ سے جا ملنے کا امکان ہوتا ہے۔

بدعت کے مذموم نہ ہونے کے یعنی ایسی بات جس کی اصل قرآن وسنت میں موجود ہو حضرت عمر بن خطابؓ نے اسے [illegible] یعنی بدعت حسنہ قرار دیا ہے۔[1] ہماری رائے میں یہ اجتہاد کی ایک نوع یا جزو ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمیں عہد صحابہ سے ملتی ہیں۔ ہم یہاں بطور نمونہ صرف دو مثالیں پیش کریں گے:

۱۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ میں آپ بھی اور صحابہ بھی رمضان شریف میں قیام

---

[1] صحیح بخاری، باب فضل من قام رمضان، رقم الحدیث: ۲۰۱۰

اللیل انفرادی طور پر کرتے تھے۔ اپنی زندگی کے آخری زمانے میں آپ ﷺ نے بعد نماز عشاء چند دن مسجد میں باجماعت قیام اللیل کیا اور جب لوگوں کو اس کی خبر ہوئی تو صحابہ کثرت سے جماعت میں آنے لگے۔ یہ قیام اللیل چونکہ نفل تھا اس لیے آپ ﷺ نے چند دن بعد جماعت سے اس کی ادائیگی موقوف فرما دی تا کہ لوگ کہیں اسے فرض یا واجب نہ سمجھنے لگیں۔

آپ ﷺ کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں بھی انفرادی نوافل پڑھنے کا طریقہ لوگوں میں مروج رہا لیکن حضرت عمرؓ نے لوگوں کو مسجد میں متفرق نماز پڑھتے دیکھا تو آپ کے دل میں خیال آیا کہ کیوں نہ انہیں جماعتی نظم میں پرو دیا جائے۔ چنانچہ آپ کے حکم پر قیام اللیل کے نوافل جماعت سے پڑھے جانے لگے جنہیں ہم آج کل نماز 'تراویح' کہتے ہیں۔ حضرت عمرؓ ایک دفعہ مسجد کے باہر سے گزرے اور آپ نے لوگوں کو جماعت سے تراویح پڑھتے دیکھا تو خوش ہوئے اور اپنے اس عمل کو 'بدعت حسنہ' قرار دیا۔

۲۔ دوسرا واقعہ حضرت عثمانؓ کے عہد کا ہے۔ عہد نبوی سے لے کر آپ کے زمانے تک جمعہ کے دن ایک ہی اذان ہوتی تھی۔ آپ کے زمانے میں مدینہ کی آبادی پھیل گئی اور اس زمانے میں لاؤڈ سپیکر بھی نہ تھے اور نہ لوگوں کے پاس گھڑیاں (Watchs) ہوتی تھیں۔ چنانچہ کئی لوگ جنہیں دور سے آنا ہوتا تھا وہ نماز میں بروقت نہ پہنچ پاتے۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے ایک اذان پہلے دینے کا حکم دیا تا کہ لوگ بسہولت مسجد میں پہنچ سکیں۔[۱]

اب ان دونوں واقعات پر غور فرمائیے:

ا۔ یہ دونوں امور بظاہر نئے ہیں لیکن صحابہ میں سے کسی نے انہیں 'بدعت' کہہ کر رد نہیں کیا کیونکہ دونوں کی اصل شریعت میں موجود تھی۔ رمضان میں قیام اللیل کی فضیلت قرآن وسنت میں موجود ہے[۲] اور خود آپ ﷺ نے کچھ دن جماعت سے نماز تراویح پڑھائی تھی لہٰذا اگر حضرت عمرؓ نے امت کو اسے جماعت سے پڑھنے پر جمع کر دیا تو یہ بدعت مذمومہ نہ تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام میں سے کسی سے اس کی مخالفت مروی نہیں اور ہمارے سارے ائمہ اور مجتہدین اجماع صحابہ کو حجت قرار دیتے ہیں اور اس پر اجماع صحابہ ہی نہیں اب تو اجماع وتعامل امت بھی موجود ہے۔

اسی طرح حضرت عثمانؓ کے جمعہ کے دن دوسری اذان مروج کرنے کی کسی صحابی نے

---

[۱] صحیح بخاری، بَابُ الجُلُوسِ عَلَى المِنْبَرِ عِنْدَ التَّأْذِينِ، رقم الحدیث: ۹۱۵

[۲] صحیح بخاری، باب تطوع قیام رمضان من الإیمان، رقم الحدیث: ۳۷

مخالفت نہیں کی اور اس وقت سے امت اس پر عمل کر رہی ہے گویا حضرت عثمانؓ کے اس اجتہاد پر بھی صحابہ اور امت کا اتفاق ہے اور یہ جائز اجتہاد تھا نہ کہ بدعت مذمومہ کیونکہ اذان کا مقصد لوگوں کو نماز کے لیے جمع کرنا ہے۔ رمضان میں سحری کے وقت دو اذانوں کی خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت دی۔ ایک لوگوں کو باخبر کرنے کے لیے کہ سحری کھانے کا وقت ختم ہو رہا ہے اور دوسری نماز میں آنے کے لیے۔ آج کل حرمین میں (اور ہماری بعض مساجد میں بھی) فجر کے وقت دو اذانیں دی جاتی ہیں: ایک تہجد کی اور دوسری فجر کی فرض نماز کے لیے، اور اس پر کوئی اعتراض نہیں کرتا کہ یہ مقاصد شریعہ کو پورا کرنے والی ہیں نہ کہ ان کی مخالف۔

بدعت حسنہ و مذمومہ کے درمیان خط امتیاز کھینچنے کے حوالے سے یہ نکتہ بھی ذہن میں رہے کہ ایک ہے 'مطابق قرآن وسنت' ہونا اور دوسرا ہے ''قرآن وسنت کی نصوص اور مقاصد کے خلاف نہ ہونا''۔ ہماری رائے میں حدیث کے الفاظ مذکورہ بالا بیانیے کے جزو آخر کو بھی بدعت مذمومہ سے باہر قرار دیتے ہیں اور اس سے بدعت حسنہ کا دائرہ بہت وسیع ہو جاتا ہے۔

بدعت مذمومہ و محدثات کی بحث یہاں روک کر ہم چاہتے ہیں کہ اجتہاد اور اس کے دائرہ کار پر کچھ گفتگو کر لی جائے تاکہ کار تجدید کا دائرہ کار کھل کر ہمارے سامنے آسکے۔

اجتہاد اور اس کا دائرۂ کار

ہمارے علماء کرام وفقہائے عظام عموماً فنی لحاظ سے اجتہاد کو فقہی احکام تک محدود سمجھتے ہیں لیکن اگر ہم اجتہاد کی تعریف، نوعیت اہمیت اور سکوپ کو ذہن میں رکھیں تو اجتہاد کا ایک وسیع تر دائرہ کار سمجھ میں آتا ہے۔ اجتہاد دراصل یہ ہے کہ جن معاملات میں حکم شرعی واضح طور پر قرآن وسنت میں موجود نہ ہو وہاں قرآن وسنت کی تعلیمات کی روشنی میں ان سے استنباط کرتے ہوئے، ان پر قیاس کرتے ہوئے اور مقاصد شریعت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور قرآن وسنت سے مستنبط کردہ دلائل وامارات کے ذریعے (جیسے سد الذریعہ، استحسان، مصالح مرسلہ وغیرہ) حکم شرعی کے انکشاف اور تعیین کی کوشش کی جائے۔ اس طرح جو حکم ہمیں حاصل ہوتا ہے وہ 'حکم اجتہادی' ہوتا ہے نہ کہ 'حکم منصوص'۔ حکم منصوص قطعی، حتمی اور خطا سے پاک ہوتا ہے جبکہ 'حکم اجتہادی' میں خطا کا امکان بھی ہوتا ہے اور وہ حالات کے بدلنے سے بدل بھی جاتا ہے اور وہ کسی کے لیے حجت نہیں ہوتا الا یہ کہ کوئی اسے اوفق بالقرآن والسنۃ سمجھے، اسے قرآن وسنت کی نصوص کا صحیح فہم اور استنباط سمجھے اور اسے قرآن وسنت کی صحیح تعبیر وتاویل گردانے۔

اب اس اجتہاد کے دائرہ کار کو سمجھیے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ بہت وسیع ہے چونکہ یہ عملاً ممکن نہیں تھا کہ دین کی ہر بات پوری تفصیل کے ساتھ قرآن مجید میں بیان کر دی جاتی، اس لیے بہت سی چیزوں کی وضاحت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دی اور وہ جزو دین بن گئیں۔ اس کے باوجود چونکہ آپ اللہ کے آخری نبی تھے اس لیے اس دین کو قیامت تک کے لیے قابل عمل بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں یہ حکیمانہ طریقہ اختیار فرمایا کہ جن بنیادی امور کی وضاحت کے بغیر چارہ نہ تھا اس کے لیے مستقل اور نا قابل تغیر نصوص نازل فرما دیں (جیسے عقائد، عبادات اور اخلاق سے متعلق اکثر باتیں) لیکن جن امور کو حالات کے ساتھ بدلنا تھا ان میں پالیسی امور طے فرما دیے اور تفصیلات کا تعین امت (کے اہل علم یعنی مجتہدین) پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے زمانے کے حالات اور ضرورتوں کے مطابق اجتہاد کر کے تفصیلات کا تعین کر لیں۔ ان میں معاملات کی ساری انواع شامل ہیں جنہیں آج کل ہم عمرانی علوم (Social Sciences) میں زیر بحث لاتے ہیں جیسے تعلیم و تربیت، معیشت، تجارت، معاشرت، سیاسیات، عدلیہ، قانون وغیرہ۔ [۱]

معاملات کے ان سب شعبوں میں مسلم اہل علم نے جو اضافے کیے اور جو تفصیلات وضع کیں انہیں ماہرین اصول فقہ اگر ٹیکنیکلی اجتہاد نہ بھی کہیں تو ہیں وہ اصلاً اسی نوعیت کی چیز۔ مثلاً تعلیم و تزکیہ کو دیکھیے (جو حکم خداوندی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بنیادی فریضہ تھا) کہ امت نے مساجد کے ساتھ مدارس بنانے شروع کر دیے اور لوگوں کے تزکیۂ نفوس کے لیے خانقاہیں/زاویے بنانا شروع کر دیے۔ نظام عدالت شروع میں منضبط نہ تھا، بتدریج اس کا نظام بنتا گیا۔ جہاد شروع میں رضا کارانہ تھا، پھر چھاؤنیاں بنیں اور تنخواہ دار فوج رکھی جانے لگی۔ سیاسی امور میں دیکھیے کہ تقرر خلیفہ میں خلافت راشدہ میں کچھ تجربے کیے گئے پھر ایک صحابی (حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ) ہی کے ہاتھوں اس میں ملوکیت کی طرف کچھ میلان ہوا جو بعد میں بڑھتا گیا۔ ہم عرض یہ کرنا چاہتے ہیں کہ ان تفصیلات کا تعین اور شرعی تعلیمات اور پالیسی امور کو پھیلا کر ایک نظام کی شکل دینا (جیسے اسلام کا تعلیمی نظام، اسلام کا عدالتی نظام، اسلام کا سیاسی نظام اور اسلام کا معاشی نظام وغیرہ) ایک اجتہادی پروسیس تھا جس سے اسلامی معاشرہ، اسلامی ریاست اور اسلامی تہذیب کا قیام، استحکام اور استمرار وجود میں آیا۔ یہ امور خدانخواستہ بدعت نہ تھے اور نہ کبھی امت نے انہیں بدعت سمجھا بلکہ یہ ایک نوع کا اجتہادی اور حرکی عمل تھا جو امت میں صدیوں جاری رہا اور آج بھی کسی حد تک جاری ہے۔ اسے اگر ٹیکنیکلی اجتہاد نہ بھی کہا جائے تو ہے یہ اجتہاد ہی کی نوعیت کی چیز۔

---

[۱] بلکہ اس کی توسیع کے طور پر غالباً سائنس و ٹیکنالوجی اور فنون میں ترقی کو بھی اسی قبیل کی چیز سمجھا جا سکتا ہے۔

ہم اس کی ایک مثال دے کر اس بات کو واضح کریں گے اور پھر صلب موضوع کی طرف لوٹیں گے۔ امت کے علماء و مجتہدین نے تعلیم کے لیے مدرسے اور تزکیہ و تربیت کے لیے خانقاہیں بنائیں اور ان پر صدیوں عمل رہا اور آج بھی ہے لیکن ہمارے عہد کے ایک بڑے عالم اور مصلح مولانا محمد الیاسؒ نے اس تعلیم و تزکیے کے نظام کو یکجا کر کے ایک نیا منہج اور طریقہ نکالا یعنی لوگوں کو ان کے گھروں اور ان کے کام کاج سے نکال کر وہ انہیں مسجد میں لائے جہاں خود ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام بھی کیا اور ان کے ذریعے دوسرے لوگوں کی تعلیم و تربیت کا سامان بھی ہوا۔ 'تبلیغی جماعت' کے کام کرنے کا یہ طریقہ، نظام اور ڈھانچہ ایک نیا منہج ہے جو مولانا الیاسؒ نے امت کے سابقہ تجربات کو سامنے رکھ کر وضع کیا۔ ہم اسے بدعت نہیں ان کا اجتہاد کہیں گے۔ جو اس طریقے کو دینی تربیت کے لیے مفید سمجھتا ہے اس پر عمل کرتا ہے اور جو نہیں سمجھتا وہ اس پر عمل نہیں کرتا۔ دینی لحاظ سے ان دونوں رویوں میں کوئی خرابی نہیں۔

تلخیصاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ فنی لحاظ سے اجتہاد اس چیز کا نام ہے کہ ''کسی مسئلے میں قرآن و سنت کا واضح حکم نہ ملے تو نصوص کی روشنی میں اور ان پر قیاس اور ان سے استنباط کرتے ہوئے اور مقاصد شریعت کو سامنے رکھتے ہوئے مجتہد کا رائے قائم کرنا یا اس مسئلے کا حل ڈھونڈنا''۔ تاہم مندرجہ ذیل امور بھی توسیعی طور پر اجتہاد ہیں یا اجتہاد کے منہج کا جزو ہیں:

❁ **نصوص کی تشریح:** نصوص کی تشریح خود ایک مکمل فن ہے جس میں اس کا اسلوب (لغوی تشریح [Literal Interpretation] اور آزادانہ تشریح [Liberal Interpretation] حروف والفاظ کی معانی پر دلالت، سیاق و سباق کا لحاظ، نص کی قدامت (مثلاً حدیث کس زمانے کی ہے اور کیا بعد والی حدیث نے اسے منسوخ تو نہیں کر دیا؟) شامل ہیں۔

❁ **نصوص کے عملی اطلاق و نفاذ کے لیے قواعد اور تفصیلات وضع کرنا:** مثلاً قرآن نے کہا کہ چور کے ہاتھ کاٹ دو۔ سنت نے مزید کچھ تفصیلات فراہم کیں کہ ہاتھ کہاں سے کاٹا جائے اور کتنے مال کی چوری پر کاٹا جائے وغیرہ تاہم مزید کچھ تفصیلات پھر بھی درکار ہوں گی مثلاً اگر چور چوری کا اقرار نہ کرے تو چوری ثابت کیسے کی جائے گی؟ ہاتھ کاٹتے وقت ڈاکٹر کا پاس ہونا اور چور کو علاج کی سہولت مہیا کرنا ورنہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جریان خون سے اس کی موت واقع ہو جائے۔ چوری کے گواہوں کے عادل ہونے (تزکیۃ الشہود) کی تفصیلات وضع کرنا۔ اگر چوری نصاب سرقہ سے کم ہو تو قاضی اسے تعزیری سزا کتنی دے؟ اگر چور ایک سے زیادہ بار چوری کرے یا بار بار چوری

کرے تو اسے کتنی سزا دی جائے؟ اگر انٹرنیٹ ٹرانزیکشن کے ذریعے چوری ہو، مجرم اقرار نہ کرے اور عادل گواہ موجود نہ ہوں تو کیا حد نافذ کی جائے گی؟ غرض نفاذ حد سرقہ میں کئی چیزیں ایسی ہیں جن کی تفصیلات وضع کرنے کے لیے اجتہاد کرنا ناگزیر ہے۔

❁ قرآن حکیم کا مخصوص اسلوب یعنی معاملات وغیرہ کے جن تغیر پذیر پہلوؤں پر شارع حکیم نے عمداً اور حکمت کے پیش نظر تفصیلات مہیا نہیں کیں بلکہ انہیں امہ (کے مجتہدین) پر چھوڑا ہے تاکہ وہ اپنے زمان ومکان کی ضروریات کے پیش نظر نصوص کی روشنی میں تفصیلات وضع کرلیں۔ اس میں ساری سوشل سائنسز (معاشیات، سیاسیات، تعلیم وغیرہ) شامل ہیں۔

❁ وہ امور جن میں شریعت نے عمداً مداخلت نہیں کی اور ان کے بارے میں ہدایات نہیں دیں بلکہ انہیں امت (مخاطبین و مکلفین) کے دنیاوی علم وتجربے پر چھوڑا ہے کہ وہ ان میں جدت وتنوع سے کام لیتے رہیں (جیسے فزیکل سائنسز، طب، ریاضی، انجینئرنگ، زراعت وصنعت، سائنسی ایجادات اور ٹیکنالوجی.... وغیرہ) جیسا کہ کھجوروں کے پیوند والے واقعے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی رائے واپس لے لی اور انصاری کسانوں سے کہا کہ أَمْرِ دُنْيَاكُمْ، فَشَأْنُكُمْ بِهِ، وَإِنْ كَانَ شَيْئًا مِنْ أَمْرِ دِينِكُمْ، فَإِلَيَّ تم اپنے یہ دنیاوی معاملات بہتر سمجھتے ہو لہٰذا جو مناسب سمجھو وہ کرو۔ البتہ اگر کوئی دینی معاملہ (امور تکلیفیہ میں سے) ہو تو مجھ سے رجوع ضروری ہے۔[۱]

❁ **جہاں حکم شرعی مبنی بر نص موجود نہ ہو وہاں مقاصد شریعت کو سامنے رکھنا:** اس کی مثال خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا یہ واقعہ ہے کہ ایک سریہ میں مجاہدین کے کمانڈر نے غصے میں آکر اور اسے اتباع امر کا تقاضا سمجھتے ہوئے، صحابہ کو آگ میں کود جانے کا حکم دیا۔ صحابہ کرام نے ان صاحب کا حکم ماننے سے انکار کردیا کیونکہ یہ مقاصد شریعت کے خلاف تھا۔ واپسی پر جب یہ بات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں لائی گئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان صحابہ کرام کے موقف کی تائید کی جنہوں نے خلاف مقاصد شریعت حکم دینے والے کمانڈر کا حکم ماننے سے انکار کردیا تھا۔[۲]

یہاں یہ دقیق نکتہ پیش نظر رہے کہ ماہرین اصول فقہ اور مجتہدین مصلحت، مسلمانوں کے لیے نفع بخش ہونے اور تنگی کی بجائے آسانی اور نرمی کے پیش نظر بھی اجتہادی فیصلے کرتے ہیں

[۱] سنن ابن ماجہ، بَابُ تَلْقِيحِ النَّخْلِ، رقم الحدیث: ۲۴۷۱

[۲] صحیح بخاری، بَابُ سَرِيَّةِ عَبْدِاللّٰہِ بْنِ حُذَافَةَ السَّهْمِيِّ، رقم الحدیث: ۴۳۴۰

خصوصاً جب کسی امر کے حق میں اوراس کے خلاف نص موجود نہ ہو۔ ایسا وہ دو امور کی بنیاد پر کرتے ہیں: ایک یہ کہ کسی امر کے مسلمانوں کے لیے نفع بخش ہونے اور تنگی کی بجائے آسانی اور نرمی پر مبنی ہونے کی تحسین خود نص سے ثابت ہے[۱] اور دوسرے یہ کہ زیر بحث معاملہ مقاصد شریعت کو پورا کرنے والا ہو اور ان کے خلاف نہ ہو۔

یہ جو ہم نے اجتہاد کے وسیع تر دائرہ کار کا ذکر کیا ہے، یہ ہماری طرف سے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ متقدمین جب اجتہاد کرتے تھے تو علوم اور زندگی کے سارے شعبے اس کے دائرے میں شامل ہوتے تھے۔ ہم نے صرف آج کی زبان اور اسلوب میں اور مختلف شعبہ ہائے علوم اور شعبہ ہائے حیات کا الگ الگ ذکر کر دیا ہے تا کہ آج کے انسان کو اس کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

کیا بدعت، تجدد اور 'دین کی نئی تعبیر' اجتہاد ہے؟

اجتہاد کے وسیع دائرے کے ذکر کے بعد اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا بدعت، تجدد اور 'دین کی نئی تعبیر' اجتہاد کی ایک قسم یا اس کے اجزا ہیں؟ ہم ایک ایک کر کے اس کا جواب دیں گے۔

بدعت اور اجتہاد

بدعت مذمومہ اجتہاد نہیں ہے کیونکہ اجتہاد یا تو قرآن وسنت کی نصوص پر قیاس یا ان سے استنباط پر مبنی ہوتا ہے یا ایسی ادلہ اور امارات کی مدد سے کیا جاتا ہے جو نص سے ثابت ہوتی ہیں اور یا پھر وہ مقاصد شریعت کو پورا کرنے والا ہوتا ہے جب کہ بدعت مذمومہ میں یہ چاروں صفات موجود نہیں ہوتیں لہٰذا وہاں اجتہاد قابل قبول نہیں ہوتا بلکہ قابل رد ہوتا ہے۔

البتہ بدعت حسنہ یعنی وہ نئے امور جن میں مندرجہ بالا چاروں صفات پائی جائیں، انہیں اجتہاد کی ایک نوع سمجھا جانا چاہیے خواہ وہ اجتہاد کی فنی تعریف پر پورا نہ بھی اتریں۔

تجدد اور اجتہاد

بدعت کی تعریف ہم اوپر ذکر کر چکے کہ یہ وہ امور ہیں جن کی اصل شریعت میں موجود نہ ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے لیے محدثہ (جمع محدثات) کا لفظ استعمال کیا یعنی ہر وہ جدید امر یا ہر وہ نئی بات جس کی اصل دین میں نہ ہو وہ تجدد ہے اور محدثات میں سے ہے۔

---

[۱] يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ [البقرہ۲:۱۸۵]

اس صورت میں متجدد ماسوا اسلام کسی دوسری فکر سے متاثر ہوتا ہے اور اسے صحیح سمجھ کر قبول کرتا ہے اور لوگوں سے کروانا چاہتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اگر وہ امت پر ماسوا اسلام کسی دوسری فکر کو علی الاعلان پیش کرے گا تو لوگ اس کو رد کر دیں گے لہٰذا وہ اپنی فکر کو لوگوں کے لیے قابل قبول بنانے کے لیے یہ حیلہ اور طریقہ اختیار کرتا ہے کہ وہ اسلامی نصوص واحکام کی ایسی تشریح کرتا ہے جو اس غیر اسلامی فکر کی روح اور تقاضوں کے مطابق ہو۔ یہ اجتہاد نہیں تجدد ہے۔

مسلمانوں میں جو متجدد ہوئے ہیں یا اس وقت بھی ہیں، ظاہر ہے وہ اپنے علمی کام کو بدعت کہلوانا پسند نہیں کرتے اور نہیں کر سکتے کیونکہ اگر ان کے افکار پر بدعت مذمومہ کا ٹھپہ لگ جائے تو ظاہر ہے کہ ان کی بات کوئی نہیں مانے گا لہٰذا ان کا ادعا یہ ہوتا ہے کہ جو وہ کہہ رہے ہیں وہ جائز اجتہاد ہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو علمی آراء وہ پیش کرتے ہیں وہ ماسوا اسلام پر مبنی ہوتی ہیں۔ معتزلہ قدیم یونانی فلسفہ ودانش سے مرعوب تھے اور اس فلسفہ ودانش کی روشنی میں انہوں نے اسلامی نصوص وتصورات کی نئی تشریح وتعبیر کی جسے امت نے رد کر دیا۔ اسی طرح آج کے معتزلہ یعنی وہ اسلامی دانشور جو مغربی فکر وتہذیب کی دنیا پر بالادستی سے مرعوب ہیں اور اسے ہی صحیح بلکہ معیار حق سمجھتے ہیں اور اسی کی روشنی میں اپنی آرا قائم کرتے ہیں لیکن اگر وہ اس بات کا صاف صاف اظہار کریں تو ظاہر ہے کوئی مسلمان ان کی بات نہیں سنے گا لہٰذا وہ سچ کو چھپاتے ہوئے جھوٹ پر مبنی یہ دعوی کرتے ہیں کہ وہ جو کہہ رہے ہیں وہ نئے حالات میں اسلام کے عین مطابق ہے اور نئے تقاضوں کے مطابق دین کی صحیح تشریح اور نیا اجتہاد ہے۔

اس کے لیے وہ نصوص کی ایسی تشریح کرتے ہیں پچھلے چودہ سو سال میں کسی نے نہیں کی۔ اس کے لیے وہ اجماع کا انکار بھی کرتے ہیں اور جمہور علماء اور جمہور امت کا بھی اور فکری حریت اور اجتہاد کے نام پر ایسی آراء پیش کرتے ہیں جو مغربی فکر وتہذیب پر مبنی ہوتی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں وہ نصوص قرآن وسنت کی ایسی تشریح کرتے ہیں جو مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کی روشنی میں کی گئی ہوتی ہے اور اس کی تعلیمات وتصورات کے مطابق ہوتی ہے۔

ہمارے ہم عصر ایک صاحب جاوید احمد غامدی ہیں جو ہمارے علاوہ سارے ثقہ اور جید علماء کے نزدیک بھی متجدد ہیں۔ ہم نے اپنے ایک مضمون (البرہان دسمبر ۲۰۱۰ء) میں یہ دکھایا ہے کہ

کس طرح ان کی ساری آراء مغربی فکر وتہذیب کے تصورات اور اقدار کی تائید کرتی ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی فکر کا ماخذ مغربی فکر وتہذیب کی تعلیمات، اصول اور اقدار ہیں نہ کہ اسلامی تعلیمات اور اصول، البتہ وہ ظاہر یہی کرتے ہیں کہ یہ اسلام کی صحیح تشریح ہے۔ ان کا ادعا یہ ہے کہ وہ نئے حالات اور نئے تقاضوں کے مطابق قرآن وسنت کی نصوص کی نئی تشریح کر رہے ہیں جو بطور عالم اور فقیہ ان کا حق ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر اجتہاد کسی نہ کسی علت پر مبنی ہوتا ہے اور اگر حالات کے بدل جانے سے علت بدل جائے تو حکم بدل جائے گا کہ "ĩûŷŗøcý/ DVHjl Ũþø`" لیکن اس کا یہ مطلب کب ہے کہ کوئی صاحب ماسوا اسلام (مثلاً مغرب کی الحادی فکر وتہذیب سے) متاثر و مرعوب ہو جائیں، اسے صحیح سمجھنے لگیں اور اسلامی نصوص واحکام کی تشریح اس غیر اسلامی فکر کی روشنی میں کرنے لگیں تو اسے "ĩûŹŷŗøcý/ DVHjl Ũþø`" سمجھ کر قبول کر لیا جائے بلکہ یہ صریح بدعت اور تجدد ہے اور یہ ناجائز وغلط اجتہاد ہے۔

ایسے تجدد کو رد کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کا یہ حکم کافی ہے کہ:

❁ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ [آل عمران ۳:۸۵]

''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

نیز اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار اور یہود ونصاریٰ کی تقلید سے منع کرتے ہوئے فرمایا:

❁ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿51﴾ [المائدہ ۵:۵۱]

''اے ایمان والو! یہود اور نصاریٰ کو دوست نہ بناؤ یہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو شخص تم میں سے ان کو دوست بنائے گا وہ بھی انہی میں سے ہوگا۔ بے شک اللہ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

❁ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿57﴾

[المائدہ ۵:۵۷]

’’اے ایمان والو! جن لوگوں کو تم سے پہلے کتابیں دی گئی تھیں ان کو اور کافروں کو جنہوں نے تمہارے دین کو ہنسی اور کھیل بنا رکھا ہے دوست نہ بناؤ اور مومن ہو تو خدا سے ڈرتے رہو۔‘‘

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ؕ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَآءُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ۖۚ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُهُمْ اَكْبَرُ ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿118﴾ هٰاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۖۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ؕ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿119﴾ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِهَا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿120﴾ [آل عمران ۳:۱۱۸تا ۱۲۰]

’’مومنو! کسی غیر (مذہب کے آدمی) کو اپنا رازدان نہ بنانا یہ لوگ تمہاری خرابی اور (فتنہ انگیزی کرنے) میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے اور چاہتے ہیں کہ (جس طرح ہو) تمہیں تکلیف پہنچے۔ ان کی زبانوں سے تو دشمنی ظاہر ہو ہی چکی ہے اور جو (کینے) ان کے سینوں میں مخفی ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ اگر تم عقل رکھتے ہو تو ہم نے تمہیں اپنی آیتیں کھول کھول کر سنا دی ہیں۔ دیکھو تم ایسے (صاف دل) لوگ ہو کہ ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہو حالانکہ وہ تم سے دوستی نہیں رکھتے اور تم سب کتابوں پر ایمان رکھتے ہو (اور وہ تمہاری کتاب کو نہیں مانتے) اور جب تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم ایمان لے آئے اور جب الگ ہوتے ہیں تو تم پر غصے کے سبب انگلیاں کاٹ کاٹ کھاتے ہیں (ان سے) کہہ دو کہ (بدبختو) غصے میں مر جاؤ خدا تمہارے دلوں کی باتوں سے خوب واقف ہے۔ اگر تمہیں آسودگی حاصل ہو تو ان کو بری لگتی ہے اور اگر رنج پہنچے تو خوش ہوتے ہیں اور اگر تم تکلیفوں کی برداشت اور (ان سے) کنارہ کشی کرتے رہو گے تو ان کا فریب تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکے گا یہ جو کچھ کرتے ہیں خدا اس پر احاطہ کیے ہوئے ہے۔‘‘

اس بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہماری یہ رہنمائی فرمائی ہے:

* خالفوا اليهود والنصارىٰ.[۱]

---

[۱] مسند احمد: ۵/۲۶۴، ۲۶۵

یعنی (بہت سے معاملات میں آپ نے فرمایا کہ) یہود ونصاریٰ کی مخالفت کرو۔

❁ سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں آپ نے فرمایا کہ یہود اللہ کے مغضوب علیہم ہیں اور نصاریٰ الضالین یعنی گمراہ ہیں۔[۱] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے ہماری کتاب ''اسلام اور تہذیب مغرب کی کشمکش''۔

❁ اور اسے رد کرنے کے لیے نبی کریم ﷺ کا یہ قول کافی ہے کہ "من احدث فی امرنا هذا لیس فیه فهو رد" اور یہ کہ کل بدعة ضلالة اور`ì iÉ'adÜäEønL/۔

❁ اور ایسے شخص کی آراء کو رد کرنے کے لیے یہ بات بھی کافی ہے کہ اس کی آراء صحابہ و مجتہدین کے اجماع اور جمہور علماء و جمہور امت کے موقف کے خلاف ہیں۔

'دین کی نئی تعبیر' اور اجتہاد

یہ صحیح ہے کہ قرآن حکیم کے عجائبات کبھی ختم نہیں ہوتے اور یہ ایک اتھاہ سمندر ہے جو موتیوں سے بھرا ہوا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نعوذ باللہ قرآن عمر و عیار کی زنبیل ہے کہ اس میں سے جو چاہے برآمد کیا جا سکتا ہے۔ نہیں! قرآن حکیم ایک انسانی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اس کے اکثر الفاظ ایسے ہیں جن کے ایک سے زیادہ لغوی معنی لیے ہی نہیں جا سکتے۔ اسی طرح بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی تشریح و تفسیر خود نبی کریم ﷺ نے فرما دی ہے۔ وہ گویا ان آیات کی سرکاری (Official) اور مستند تشریح ہے جسے وحی کی جلی یا خفی تائید حاصل ہوتی ہے (جلی تائید وہ ہے جس میں آپ ﷺ نے کوئی رائے قائم کی ہو اور قرآن نے واضح الفاظ میں اس کی تائید کر دی ہو اور خفی تائید یہ ہے کہ آپ نے ایک رائے قائم فرمائی جبکہ وحی نازل ہو رہی تھی لیکن وحی نے اس کی مخالفت نہیں کی۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ بات خلاف منشائے الٰہی ہوتی تو لازماً اس کی تصحیح کر دی جاتی۔ لیکن جب اس کی تصحیح کے لیے وحی نہیں اتری تو گویا اسے قرآن کی تائید حاصل ہے کیونکہ خود قرآن کہتا ہے کہ:

❁ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ [الذاریات ۵۳: ۳، ۴]

''اور نہ خواہش نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں یہ (قرآن) تو حکم خدا ہے جو (ان کی طرف) بھیجا جاتا ہے۔''

---

[۱] سنن ترمذی، ابواب تفسیر القرآن

﴿ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿43﴾ وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ﴿44﴾ لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ﴿45﴾ [الحاقۃ ۶۹: ۴۳ تا ۴۵]

''یہ تو) پروردگار عالم کا اُتارا (ہوا) ہے۔ اگر یہ پیغمبر ہماری نسبت کوئی بات جھوٹ بنالاتے تو ہم ان کا داہنا ہاتھ پکڑ لیتے۔''

تاہم قرآن حکیم کے کئی الفاظ ایسے ہیں جن کے دو معنی لیے جاسکتے ہیں اور وہ ایک دوسرے کے نقیض نہیں ہوتے لہٰذا ان دونوں میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے سے زیادہ فرق نہیں پڑتا لیکن ان کے تیسرے معنی لیے جانے کی گنجائش لغوی لحاظ سے موجود ہی نہیں ہوتی۔ پھر صحابہ، تابعین، مفسرین، محدثین، فقہا، لغویین غرض ہزاروں اہل علم نے جو اپنی ذہانت وفراست، وفور علم اور تقوی میں یکتائے روزگار تھے، پچھلے چودہ سو سال میں قرآن وسنت کی نصوص پر غور کیا ہے اور ان میں سے اکثر نے ساری عمر اسی کام میں کھپا دی ہے لہٰذا یہ کہنا ناممکن لگتا ہے کہ قرآن وسنت کے معانی اور مفاہیم ان سے مخفی رہ گئے ہوں گے۔

لیکن چلیے ہم بر بنائے بحث وافتراض یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ آج ۱۴۳۸ھ میں دین کا ایک عالم قرآن حکیم کی کسی آیت یا حدیث کا کوئی ایسا مفہوم سامنے لاسکتا ہے جو پہلوں سے مختلف ہو یا ان کی سمجھ میں نہ آیا ہو۔ [۱] لیکن نقلاً وعقلاً یہ تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ صحابہ کرامؓ، تابعین اور تبع تابعین (کہ ان تینوں کے خیر القرون ہونے کی سند حدیث میں موجود ہے۔ [۲]) اور پچھلے چودہ سو سال میں ہزاروں لاکھوں مفسرین، محدثین اور فقہا یعنی جمہور علماء اور جمہور امت یہ نہ سمجھے ہوں کہ دین کیا ہے؟ دین کی ترجیحات کیا ہیں اور اس کے بنیادی تصورات اور اہم عناصر کون سے ہیں؟ اور آج ۱۴۳۸ھ یعنی پندرھویں صدی ہجری میں کوئی عالم اور سکالر اٹھ کر کہے کہ دین یہ اور یہ ہے، اس کے اہم اجزاء اور عناصر یہ ہیں اور اس کی ترجیحات یہ اور یہ ہیں اور وہ صحابہ کرامؓ وتابعین اور جمہور علماء اور جمہور امت سے مختلف بات کہے۔ تو اس کی بات قبول نہیں کی جائے گی، رد کر دی جائے گی کیونکہ وہ بدعت ہوگی یا تجدد کہ اجتہاد کا یہ دائرہ کار ہے ہی نہیں کہ وہ یہ طے کرے کہ دین کا

---

[۱] کئی جید اور ثقہ علماء کے ہاں بھی ایسے تفردات (یعنی شاذ آراء) بعض اوقات سامنے آجاتی ہیں جنہیں کوئی نہیں مانتا، کوئی صحیح نہیں سمجھتا سوائے ان صاحب کی اپنی ذات کے یا اکا دکا کسی فرد کے اور جمہور علماء ایسے تفردات یا شاذ آراء سے صرفِ نظر کر کے گزر جاتے ہیں۔

[۲] ''خَيْرُكُمْ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ'' صحیح بخاری، بَابٌ: لَا يَشْهَدُ عَلَى شَهَادَةِ جَوْرٍ إِذَا أُشْهِدَ، رقم الحدیث: ۲۶۵۱

مفہوم کیا ہے اور اس کی ترجیحات کیا ہیں؟ لہٰذا دین کی اور دین کے بنیادی تصورات و مفاہیم کی نئی تشریح کرنا سرے سے جائز اجتہاد ہے ہی نہیں کہ اسے اجتہاد کے معیار پر پرکھا جائے۔ اور یہ دیکھا جائے کہ یہ صحیح اجتہاد ہے یا اس میں کوئی غلطی ہوگئی ہے۔ یہ کارتجدید بھی نہیں کیونکہ تجدید کا مقصد دین کا چہرہ نکھار کر پیش کرنا اور اسے بدعات وتجدد اور حشو وزوائد سے پاک کرنا ہے نہ کہ صحابہ کرام، جمہور علماء اور جمہور امت کے مقابلے میں دین کی کوئی نئی تعبیر پیش کرنا۔

معیارِ حق کیا ہے؟

اجتہاد، بدعت حسنہ اور کارتجدید کے صحیح ہونے کا معیار کیا ہے؟ دیکھیے! ہر چیز کا معیار قرآن وسنت ہے جیسا کہ قرآن وسنت نے خود صراحت کردی ہے [۱]۔ لہٰذا یہ معیار حتمی ہے اور اس کے بارے میں کوئی دوسری رائے نہیں ہوسکتی لیکن سوال یہ ہے کہ جب اسی بات میں اختلاف ہوجائے کہ قرآن وسنت کی نصوص کا مفہوم ومقصود کیا ہے۔ ایک عالم کہے کہ میری بات یا میرا اجتہاد اوفق بالقرآن والسنۃ ہے اور دوسرا اس کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے کہے کہ میری رائے اوفق بالقرآن والسنۃ ہے اور دونوں فریق نصوص سے شرعی دلائل پیش کریں تو ان میں فیصلہ کیسے کیا جائے؟ ہماری رائے میں اس کی صورتیں مندرجہ ذیل ہوسکتی ہیں:

اجتہاد: اگر اختلاف اجتہاد میں ہو تو اس کے صحیح ہونے کے دو امکانی معیار ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ جس مسئلے کے حل کے لیے اجتہاد کیا گیا تھا، اس اجتہاد سے وہ مسئلہ بخیر وخوبی حل ہو جائے۔ دوسرا معیار یہ ہوسکتا ہے کہ لوگوں کی کتنی تعداد اس اجتہاد کو صحیح سمجھتی ہے.... اس میں کوئی شک نہیں کہ قلت وکثرتِ تعداد حق وباطل کا کوئی معیار نہیں ہوتی۔ جو چیز قرآن وسنت کے نزدیک حق ہے وہ حق ہی رہے گی خواہ اس کا ماننے والا ایک فرد ہو اور اس کا انکار کرنے والے لاکھوں کروڑوں ہوں.... لیکن جہاں معاملہ نص کا نہیں بلکہ فہم نص کا ہو اور اس میں لوگوں کا اختلاف اور نزاع ہو تو کثرت تعداد نزاع کا حل اور قرین حق ہونے کا کنایہ ضرور ہے۔ کیونکہ اگر کسی اجتہاد پر ایک خلق کثیر متفق ہو تو اگرچہ وہ اجماع نہ ہو، پھر بھی جمہور علماء اور جمہور امت کا یعنی اہل علم کی ایک

---

[۱] ہم صرف ایک آیت اور ایک حدیث پیش کرنے پر اکتفا کریں گے: قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ZO Z ZZ K X0Lb LH اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ ۚ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴿﴾ [النساء ۴:۵۹] اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں، اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت۔ جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے کبھی گمراہ نہ ہوگے۔

بڑی اکثریت کا اور کروڑوں مسلمانوں کا کسی اجتہاد کو صحیح ماننا اور اس پر عمل کرنا (یعنی تعامل امت) اس کی استنادی حیثیت کو بہر حال مضبوط کرتا ہے۔

ہم حنفیت کے لیے کوئی تعصب نہیں رکھتے لیکن اظہار حق کا یہ تقاضا ہے کہ ہم یہ بات کہیں اور ویسے بھی مشاہدہ وتجربہ ہونے کی حیثیت سے بھی یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ ماضی میں بھی علماء و مجتہدین اور عوام کی عظیم اکثریت (تقریباً ۷۰، ۷۵ فیصد) فقہ حنفی سے منتسب رہی ہے اور آج بھی ہے۔ یہ چیز بہر حال حنفی فقہاء کے اجتہادات اور استنباطات کی داخلی قوت کی مظہر ہے اور ان کی یہ قبولیت وشہرت ان کی استنادی حیثیت کو مضبوط کرتی ہے جس طرح خبر واحد کے مقابلے میں 'حدیث مشہور' قوی تر استدلال کی حامل سمجھی جاتی ہے۔

بدعتِ حسنہ

بدعت حسنہ کی حیثیت چونکہ اجتہاد ہی کی ہوتی ہے لہٰذا اس کا معیار بھی وہی ہے جو ہم نے اوپر اجتہاد میں ذکر کیا ہے۔ رمضان میں قیام اللیل یا تراویح کی مثال لیجیے کہ حضرت عمرؓ نے اجتہاداً اسے مستقلاً باجماعت ادا کرنے کا فیصلہ کیا اور صحابہ کرامؓ نے اور امت نے اسے قبول کیا۔ یہ فیصلہ اس لحاظ سے بھی صحیح ثابت ہوا کہ اس سے وہ مقصد پورا ہو گیا جو شارع کے درحقیقت پیش نظر تھا یعنی رمضان کی راتوں میں قیام اور قرآن سے وابستگی یعنی رمضان میں سارا قرآن پڑھنا اور سننا۔ اور صحابہ کرامؓ، فقہائے امت اور جمہور امت نے جس کثرت سے اسے قبول کیا اور اس پر عمل کیا اور آج تک کر رہی ہے وہ بھی اس اجتہاد کی ثقاہت، صلابت اور اس کے صائب ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

نئی تعبیر دین

دین کی نئی تعبیر کرنا کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں جیسا کہ ہم نے اوپر اجتہاد کی تعریف میں واضح کیا ہے کہ اس کا دائرہ کار بنیادی طور پر یہ ہے کہ جن امور میں کوئی حکم منصوص موجود نہ ہو، وہاں مجتہد کا نصوص پر قیاس کرتے ہوئے، ان سے استنباط کرتے ہوئے اور ان کے مقاصد کو سامنے رکھتے ہوئے اجتہادی رائے سے حکم شرعی دریافت کرنے کی کوشش کرنا۔ اس لحاظ سے دین کی نئی تعبیر کرنا کوئی اجتہادی مسئلہ نہیں کیونکہ اس میں کوئی نئی بات یا کوئی نیا مسئلہ زیر بحث نہیں آتا بلکہ یہ سمجھنا پیش نظر ہوتا ہے کہ دین ہے کیا؟ اس کے اہم اجزاء اور عناصر کیا ہیں اور اس کی ترجیحات کیا

ہیں؟ اور اس میں کوئی نیا پن نہیں، کوئی نیا مسئلہ نہیں۔ دین جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوا، جس طرح آپ نے اسے سمجھا اور اس پر عمل کیا، وہ سب کچھ آپ نے صحابہ تک منتقل کیا، انہیں سمجھایا اور ان کی اس کے مطابق تربیت کی۔ لہٰذا دین کیا ہے اور اس کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ صحابہ سے بڑھ کر کوئی نہیں جان سکتا۔ صحابہ کرام سے پھر ان کے شاگردوں (تابعین) نے دین سیکھا اور ان سے جمہور علماء فقہاء اور جمہور امت نے اسے سمجھا اور اس پر عمل کیا۔ لہٰذا فہم دین کے باب میں صحابہ کا فہم دین حجت ہے۔ اور صحابہ سے جس طرح اسلاف نے اور جمہور علماء اور جمہور امت نے دین کو سمجھا وہ بھی ایک لحاظ سے حجت ہے۔

اس تقریر کے دو نتیجے نکلے:

ایک: یہ کہ آج پندرھویں صدی ہجری میں اگر کوئی عالم دین کی ایسی تعبیر پیش کرے جو صحابہ کرامؓ کے فہم دین کے خلاف ہو تو وہ اس قابل ہے کہ اسے رد کر دیا جائے اور اگر وہ اسلاف، جمہور علماء اور جمہور امت کے فہم دین کے خلاف ہو تو بھی اس کا مخدوش ہونا اغلب ہے اور اس کا ترک کرنا بہتر ہے۔

دوم: آج اگر کوئی عالم یہ کہے کہ ماضی میں کسی نے دین کو صحیح نہیں سمجھا اور صرف میرا فہم دین ہی صحیح ہے تو اس کا یہ دعویٰ بھی رد کر دیا جائے گا کیونکہ یہ بات عقلاً محال ہے کہ دین کی حقیقت صحابہ، تابعین، جمہور علماء اور جمہور امت کی نظر سے غائب ہو گئی ہو۔ یہ دین کے الٰہی حفاظتی نظام کے بھی خلاف ہے۔ ویسے بھی مسلم معاشرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور سے لے کر آج تک تسلسل کے ساتھ موجود رہا ہے اور اس میں کوئی انقطاع واقع نہیں ہوا لہٰذا یہ کہنا کہ دین کے بنیادی حقائق صحابہ، سلف، جمہور علماء اور جمہور امت کی نظر سے مخفی رہ گئے، ایک ناقابل یقین تصور ہے۔

ایک اشکال: مسلمانوں کے زوال کا سبب کیا ہے؟

یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر امت دین کے صحیح فہم سے کبھی عاری نہیں ہوئی تو پھر اس کے زوال کا سبب کیا ہے؟ اس کے جواب میں دو پہلو پیش نظر رکھنے چاہئیں:

ایک: نظریہ ٹھیک ہونے کے باوجود اگر اس پر عمل نہ کیا جائے تو مطلوبہ نتائج نہیں نکلیں نکلتے۔ نظریے کے عمل میں نہ ڈھلنے کے محرکات واسباب متعدد اور پیچیدہ ہیں اور اس کا سبب کئی داخلی اور خارجی عوامل ہو سکتے ہیں جن پر تفصیلی گفتگو اس وقت ہمارے پیش نظر نہیں۔ مختصراً یہی کہا

جا سکتا ہے کہ اس کی داخلی اور نفسیاتی وجہ ایمان کا پختہ ہو کر یقین میں نہ ڈھلنا ہے۔ نظریے کا ''ٹھیک'' نہ ہونا اس کی بنیادی وجہ نہیں کیونکہ 'نظریہ' اگر غلط بھی ہو اور شدید وابستگی کے نتیجے میں وہ پختہ ہو کر یقین میں بدل جائے تو لازماً محرکِ عمل بنتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ مسلمانوں کے زوال کی بنیادی وجہ [1] نظریے اور تصورات کا غلط ہونا نہیں بلکہ ان سے وہ شدید وابستگی کھو دینا ہے جو محرک عمل بنتی ہے۔

دوسرے: یہ کہ کسی وقت امت کے کچھ لوگ، کچھ علماء، کچھ طبقے، کچھ گروہ دین کے صحیح فہم سے عاری ہو سکتے ہیں لیکن آج کسی عالم کا یہ کہنا کہ سارے علماء، ساری امت، صدیوں سے دین کا صحیح فہم نہیں رکھتے گویا صحابہ کا فہم دین بھی حجت نہیں اور دین کا صحیح فہم صرف وہ ہے جو میں پیش کر رہا ہوں تو یہ جسارت کی بات ہے، سوئے ظن ہے اور خود کو پیغمبرانہ مقام پر رکھنا ہے (اگرچہ بوجوہ اس کا دعوی نہ بھی کیا جائے)۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ پر وحی اترتی ہے اور آپ معصوم عن الخطا ہیں کہ آپ کا کہنا صحیح ہے اور صحابہ وسلف کا، ائمہ مجتہدین کا، لاکھوں علماء فقہاء، محدثین، مفسرین کا اور کروڑوں اربوں مسلمانوں کا سب کا فہم دین غلط ہے اور صرف آپ کا فہم دین صحیح ہے۔ آخر آپ کے اس صحیح فہم دین کی بنیاد کیا ہے؟ اگر آپ کہیں کہ قرآن وسنت ہے تو یہ قرآن وسنت تو صحابہ اور سلف کے پاس بھی تھا، ان کو آپ سے زیادہ عربی آتی تھی، وہ آپ سے بڑے عالم تھے، وہ آپ سے زیادہ متقی تھے۔ سوال یہ ہے کہ صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین، لاکھوں مفسرین، محدثین، علماء، فقہاء اور کروڑوں اربوں مسلمانوں کو، ان کی ساری نسلوں کو غلط کہنے کی بجائے آپ کے فہم دین ہی کو کیوں نہ غلط سمجھ لیا جائے۔

خلاصہ یہ کہ دین کی نئی تعبیر پیش کرنا اجتہاد نہیں ہے، یہ بدعت اور تجدد ہے۔ آج اگر کوئی عالم دین کا نیا فہم سامنے لاتا ہے، دین کی نئی تعبیر پیش کرتا ہے اور یہ فہم دین اور یہ تعبیر دین صحابہ وتابعین، ائمہ مجتہدین، لاکھوں مفسرین، محدثین، علماء، فقہاء، اور کروڑوں اربوں مسلمانوں کے فہم دین کے خلاف ہے تو خود اس کا صحیح ہونا مشکوک ومخدوش ہے اور ان سب کو غلط کہنے کی بجائے ان ایک صاحب کے فہم دین کو غلط کہہ لینا بدرجہا آسان تر ہے۔

موضوع کے اہم عناصر کو زیر بحث لانے کے بعد اب ہم دو ایسے موضوعات پر کچھ گفتگو کرنا

---

[1] اس سے مسلم فکر میں موجود بعض کمزوریوں کا کلی انکار مقصود نہیں۔

چاہتے ہیں جو خلط مبحث (Misconception) کا باعث بنتے ہیں یا جنہیں خلط مبحث کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک ہے فکری حریت کا مسئلہ اور دوسرا ہے غیر اسلامی افکار اور تہذیبوں سے استفادے کی حدود کا معاملہ۔

فکری حریت کی بحث

آج کے بعض عالم اور سکالر یہ کہتے ہیں کہ روایتی علماء فکری و فقہی جمود کا شکار ہیں جب کہ اسلام حریت فکر کا داعی ہے لہٰذا ہم دینی امور میں جو رائے چاہیں قائم کر سکتے ہیں اور نصوص قرآن وسنت کی جو تشریح چاہیں کر سکتے ہیں اس پر علماء کی کوئی اجارہ داری نہیں۔

اس بیانیے میں حقیقت کم اور مبالغہ زیادہ ہے۔ صحیح صورت حال یہ ہے کہ مسلمان بنیادی طور پر عبد ہوتا ہے [illegible] [الذاریات ۵۱:۵۶]۔ لفظ 'اسلام' کے لغوی معنی، سر تسلیم خم کرنا، مکمل اطاعت اور تابعداری کرنا ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں کسی شخص کا اللہ کو خالق و مالک و حاکم مانتے ہوئے اس کے آگے جھک جانا، اس کی پرستش کرنا، اس کے آگے، اپنی رغبت اور خوشی سے، سر اطاعت خم کر دینا، اس کی بلا حدود و بلا شروط اور بلا چوں و چرا بندگی اور اطاعت کرنا۔ لہٰذا مسلمان تو ہوتا ہی وہ ہے جو اپنی خوشی سے اپنی مرضی سے دست بردار ہو کر اللہ کی مرضی کے آگے جھک جاتا ہے لہٰذا وہ اللہ و رسول کے آگے اپنی مرضی نہیں چلا سکتا۔ اسی لیے اسلام میں ایک مسلمان کی آزادی اور حریت فکری کی مثال رسول کریم ﷺ نے اس گھوڑے سے دی ہے جو ایک لمبی رسی سے کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا ہو۔ اس کی آزادی محدود ہوتی ہے اتنی ہی جتنی رسی اسے اجازت دیتی ہے۔ مطلب یہ کہ ایک مسلمان کی آزادی بھی محدود ہوتی ہے اور وہ اللہ کی طے کردہ حدود کی رسی سے بندھا ہوتا ہے۔

ایک مسلمان کی آزادی کی حدود یہ ہیں: جہاں تک نصوص قرآن وسنت کا تعلق ہے تو بحیثیت عبد مسلمان ان کا مقلد محض ہوتا ہے اور ان پر عمل کا مکلف ہوتا ہے، خواہ ان کی حکمت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ نصوص کے بعد اس کا دائرہ کار یہ ہے: دعوت و تبلیغ [1] تعلیم و تزکیہ [2]۔ انذار اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر [3]۔ ان سب کے لیے بھی کچھ نہ کچھ صلاحیت درکار ہوتی ہے لیکن

---

[1] صحیح بخاری، بَابُ مَا ذُكِرَ عَنْ بَنِي إِسْرَائِيلَ، رقم الحدیث: ۳۴۶۱

[2] البقرہ ۲:۱۲۹

[3] آل عمران ۳:۱۱۰

مزید دو کام ایسے ہیں جس کے لیے خصوصی اہلیت درکار ہوتی ہے اور وہ ہیں: اجتہاد اور کارِ تجدید۔

پس ایک مسلمان عالم کی فکری آزادی اجتہاد کی حد تک محدود ہوتی ہے۔ جہاں تک بدعت، تجدد اور دین کی نئی تعبیر کا تعلق ہے یہ اس کی آزادی کا غلط اور ناجائز استعمال ہے۔ ہاں دعوت و تبلیغ، تعلیم و تزکیہ، انذار اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے منصوص احکام پر عمل کے ساتھ ان کے تفصیلی لائحہ عمل کے لیے اجتہاد کی گنجائش موجود ہے جیسا کہ ہم نے سطور بالا میں اجتہاد کے وسیع تر مفہوم کے حوالے سے ذکر کیا ہے۔ ان میں فرد کی اصلاح معاشرے کی اصلاح اور ریاست کی اصلاح سب شامل ہیں۔ مسلم حکمرانوں کی اصلاح اور ریاست کے اسلامی کردار کی اصلاح بھی انہی تعلیمات کا حصہ ہے۔ جہاں تک جہاد اور اعلاء کلمۃ اللہ کا تعلق ہے تو مال کے ذریعے جہاد زبان کے ذریعے جہاد، قلم کے ذریعے جہاد یعنی پرامن سرگرمیاں بھی جہاد ہی کا حصہ ہوتی ہیں۔ نفس امارہ کے خلاف مجاہدہ اور تزکیۂ نفس کی جدوجہد بھی جہاد ہی کا ایک حصہ ہے۔ تاہم جہاد بمعنی قتال صرف ریاست اور حکمرانوں کا حق ہے، خواہ وہ نیک ہوں یا بد۔ [۱]

اصل میں فکری حریت کی وہ شکل جو مغربی فکر و تہذیب میں ہے، جس کے اثرات آج کے مسلم ذہن اور معاشرے کو متاثر کر رہے ہیں وہ صریحاً غیر اسلامی ہے۔ مغرب میں چونکہ اسلام کی طرح الٰہ اور عبد کا تصور موجود نہیں اور فرد وہاں مادر پدر آزاد ہے اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں جو فیصلہ چاہے کر سکتا ہے جیسا کہ انہوں نے جوئے، شراب، زنا وغیرہ کو حلال کر رکھا ہے۔ اس طرح کی آزادی کا تصور اسلام میں موجود نہیں۔ اسی لیے اقبال نے کہا تھا کہ ؎

آزادئ افکار ہے ابلیس کی ایجاد

علماء کرام کو عام طور پر جمود کا الزام دیا جاتا ہے کہ انہوں نے اجتہاد کا دروازہ بند کر رکھا ہے۔ اگر اس بات میں وزن ہو بھی تو اس کا حل یہ ہے کہ علماء کو اس طرف متوجہ کرنے کے ساتھ جن لوگوں میں اجتہاد کی صلاحیت ہے وہ اجتہاد کریں۔ لیکن شرعی اجتہاد ہی کریں، تجدد اور بدعت میں ملوث نہ ہوں اور دین کی نئی تعبیر نہ کریں۔

غیر اسلامی افکار اور تہذیبوں سے استفادہ کا مسئلہ

ماسوا اسلام اور غیر اسلام میں ہر وہ فکر شامل ہے جو اسلام کے خلاف ہو یا اس کے مطابق نہ

---

[۱] استثنائی صورتوں کی بات الگ ہے جب ریاست اور حکمران مغلوب ہو کر کفار کے گماشتہ بن جائیں۔

ہو،خواہ وہ انسانی عقل وتدبر کا نتیجہ ہو (جیسے مغربی فکروتہذیب) اور خواہ بگڑی ہوئی مذہبی تعلیمات پر مشتمل ہو (جیسے ہندو مذہب اور ہندو تہذیب)۔

عصر حاضر میں غیر اسلامی فکروتہذیب کی سب سے بڑی اور نمائندہ مثال مغربی فکروتہذیب کی ہے جو اس وقت دنیا پر غالب ہے، جس نے عیسائیت کو کونے کھدرے میں دھکیل کر اور غیر موثر بنا کر انسانی عقل وتدبر کو وحی کی جگہ دے دی ہے اور انسان کو اپنا خدا خود بنا دیا ہے۔ اس تہذیب کے بنیادی نظریات ہیومنزم، سیکولرزم، لبرل ازم، میٹریلزم/کیپٹل ازم اور ایمپر یسزم وغیرہ ہیں۔ ہیومنزم کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنا خدا خود ہے، اسے کسی خدا کی ضرورت نہیں۔ سیکولرزم کا مفہوم یہ ہے کہ اگر کسی نے خدا کو ماننا ہی ہے تو اپنی ذاتی زندگی میں مان لے لیکن اجتماعی زندگی میں خدا کا کوئی عمل داخل، بہر حال، قبول نہیں کیا جائے گا۔ لبرل ازم کا مطلب یہ ہے کہ انسان ہر لحاظ سے آزاد ہے مادر پدر آزاد ہے، جو چاہے سوچے اور جو چاہے کرے، اس پر کوئی پابندی نہیں لگا سکتا۔ میٹریلزم کا مفہوم یہ ہے کہ دنیا کی زندگی ہی سب کچھ ہے اور انسان کی ساری تگ ودو اس دنیا کے لیے ہی ہونی چاہیے، اس کی بہتری اور سہولتوں کے لیے ہونی چاہیے۔ ایمپیر یسزم کا مطلب یہ ہے کہ وحی اور آسمانی ہدایت کی کوئی حیثیت نہیں، انسانی عقل اور مشاہدہ وتجربہ ہی حقیقی علم کا منبع ہے۔ ظاہر ہے ان ساری باتوں کا مطلب ہے خدا ورسول کی نفی، آخرت کی نفی اور آسمانی کتابوں اور ہدایت کی نفی۔ لہٰذا مغربی فکروتہذیب سو فیصد غیر اسلامی ہے۔ یہ ہر لحاظ سے اسلام سے متضاد اور اس کے برعکس ہے۔

علاوہ ازیں اس تہذیب کے علم بردار اسلام اور مسلم دشمن ہیں، انہوں نے مسلمانوں کو صدیوں غلام بنائے رکھا اور آج بھی وہ ان سے کھلم کھلا دشمنی کر رہے ہیں جس کا مشاہدہ ہر کوئی عراق، افغانستان، لیبیا، شام اور یمن میں کر رہا ہے اور جسے ہم خود پاکستان میں بھگت رہے ہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ قرآن وسنت نے واضح الفاظ میں ہم مسلمانوں کو بتایا ہے کہ یہود ونصاری ہمارے دشمن اور بدخواہ ہیں اور وہ ہمیں دین سے پھیرنا اور دور کرنا چاہتے ہیں، جیسا کہ سطور بالا میں ذکر ہو چکا۔

جب یہ ثابت ہو گیا کہ مغربی تہذیب اور اس کے افکار غیر اسلامی ہیں اور اس کے علمبردار اسلام اور مسلمانوں کے دشمن ہیں تو ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ بچتا ہے کہ ہم اس فکر وتہذیب سے دُور رہیں اور اسے یا اس کے کسی جزو کو ہرگز قبول نہ کریں۔ لیکن مسلمان چونکہ اس وقت مغلوب ہیں اور ان میں سے اکثر ذہنی وفکری طور پر مغرب کے غلام ہیں لہٰذا مغرب سے

مرعوب ومتاثر دانشوراور حکمران یہ راگ الاپتے رہتے ہیں کہ ہمیں دنیا میں ترقی کے لیے غالب، ترقی یافتہ اور بالادست مغرب کی پیروی کرنی چاہیے حالانکہ ایک مسلمان کے پیش نظر صرف دنیا کی ترقی ہی نہیں ہوتی بلکہ دنیا وآخرت دونوں کی ترقی ہوتی ہے اور مغرب کے پیش نظر آخرت کی ترقی وکامیابی سرے سے ہے ہی نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ جب ہمارے اصول زندگی اہل مغرب سے مختلف ومتضاد ہیں تو آگ اور پانی کے اس اجتماع سے کوئی فائدہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دومتضاد عناصر اول تو آپس میں مل نہیں سکتے اور اگر انہیں زبردستی ملانے کی کوشش بھی کی جائے تو ان سے کوئی مفید مرکب وجود میں نہیں آسکتا لہٰذا مسلمان مغربی تہذیب سے کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتے۔

یہی حال مغرب کے علوم اور سائنس وٹیکنالوجی کا ہے کہ ان کی ہر چیز ان کی تہذیب کے اصولوں کی پروردہ ہے اور وہ اپنی کنہ میں غیر اسلامی ہے لہٰذا ان کی ہر چیز ہمارے لیے غارت گر ایمان وعمل اور نقصان دہ ہے۔ اور ہمیں اسے ردّ کرنا چاہیے اور اس کی قبولیت کا نہیں سوچنا چاہیے۔ ہم مسلمان اگر دنیا میں ترقی کرنا چاہتے ہیں تو اس کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم اپنے اصول حیات، اپنے دین سے جڑ جائیں اور اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کو اس کے مطابق ڈھال لیں۔ جب ہم ایسا کریں گے تو اس کے نتیجے میں ہم دنیا وآخرت دونوں میں کامیاب ہوں گے جیسا کہ ماضی میں امت مسلمہ اپنے دینی اصولوں پر عمل کرکے ایک ہزار سال تک دنیا پر غالب رہی ہے اور وہ میرٹ پر ساری اقوام عالم سے اخلاق میں، علوم میں اور سائنس وٹیکنالوجی میں ساری دنیا سے آگے تھی۔ اور آج بھی ہوسکتی ہے لیکن اس کے لیے ضرورت اپنے نظریۂ حیات سے جڑنے کی ہے نہ کہ مغرب کی ملحدانہ تہذیب سے جڑنے کی۔ لہٰذا مغرب کے سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام وغیرہ سے استفادہ مسلمانوں کے لیے زہر قاتل ہے۔

اگر کسی درجے میں تھوڑی بہت گنجائش نکل سکتی ہے تو اس بات کی کہ ایسے امور میں جن کا تعلق انسانی تجربے اور مہارت سے ہو، انتظامی امور وغیرہ سے ہو انہیں مغرب سے لیا جائے اور ان میں بھی ضروری تبدیلیاں کرکے انہیں اپنی فکری اور تہذیبی ضروریات کے مطابق ڈھال لیا جائے جیسے حضرت عمرؓ نے اہل فارس کا انتظامی اور مالی سٹرکچر قبول کرلیا تھا اور اس میں ضروری ترامیم کرکے اسے 'دیوان' کے نام سے مروج کرلیا تھا اور صحابہؓ میں سے کسی نے ان کی مخالفت نہ کی۔

خلاصہ یہ کہ ہمیں مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کو اصولی طور پر رد کردینا چاہیے اور اس کی جگہ اسلامی تناظر میں اپنا سیاسی نظام، معاشی نظام، تعلیمی نظام، عدالتی نظام....وضع کرنا چاہیے نہ کہ

مغرب کی پیروی کرنی چاہیے اور نہ مغربی افکار کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کی تشریح کرنی چاہیے۔

ہمارا خیال ہے کہ ہم نے سطور بالا میں اجتہاد، تجدید، بدعت، دین کی نئی تعبیر اور جہاد کے تصورات میں فرق واضح کر دیا ہے اور ان کی شرعی حیثیت بھی واضح کر دی ہے۔ اب اس ضمن میں آخری چیز جو رہ گئی ہے وہ 'احیائے دین' کی اصطلاح ہے۔

احیائے دین

ہماری رائے میں احیائے دین کی اصطلاح غیر مناسب ہے کیونکہ دین اسلام کبھی مردہ نہیں ہوا، نہ آج ہے اور نہ آئندہ کبھی ہوگا۔ ہاں یہ مسلمان ہیں جو بحیثیت فرد اپنی انفرادی زندگی میں دینی احکام پر کماحقہ عمل کریں تو دنیا میں اطمینان قلب کی نعمت سے متمتع ہوتے ہیں اور آخرت میں اللہ کی رضا اور اس کی نعمتوں کے حق دار بنتے ہیں۔ اور اگر بحیثیت امت اپنے معاشرے اور ریاست میں دین پر عمل کریں تو بام عروج پر فائز ہوجاتے ہیں۔ اور جب وہ دین پر اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں عمل نہ کریں تو دین دشمنوں کے ہاتھوں مغلوب ہوجاتے اور زوال پذیر ہوجاتے ہیں۔ تو یہ عروج وزوال مسلمانوں کا ہے نہ کہ دین اسلام کا۔ یہی وجہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کے لیے تجدید کا لفظ استعمال کیا ہے نہ کہ احیاء کا۔

البتہ اپنی سنت کے لیے احیاء کا لفظ استعمال کرتے ہوئے فرمایا:

[illegible]

مَنْ عَمِلَ بِهَا مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْئًا [1]

یعنی جس نے میری سنت کو (اس کو ترک کیے جانے کے بعد) زندہ کیا (یعنی اس پر عمل کیا) تو اسے اپنے عمل کا ثواب بھی ملے گا اور ان سب کے اجر میں بھی اس کا حصہ ہوگا جو اس سنت پر عمل کریں گے اور اللہ کی شان یہ ہے کہ ان کے اجر میں بھی کمی نہ ہوگی۔

اس سے واضح ہوگیا کہ تجدید دین کی اصطلاح تو صحیح ہے لیکن احیائے دین کی اصطلاح درست نہیں ہے۔ هذا من عندنا، والعلم عند الله.

نوٹ: البرہان کی روایت کے مطابق ہم اس مضمون پر اہل علم کے تبصرہ وتنقید کو خوش آمدید کہیں گے۔ مدیر

---

[1] سنن ترمذی، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَخْذِ بِالسُّنَّةِ وَاجْتِنَابِ البِدَعِ، رقم الحديث: ۲۶۷۷

تعلیم و تحقیق

ڈاکٹر محمد رفیع الدین[۱]

اسلامی تحقیق کے اصول (۲)

موجودہ دور کی ایک خصوصیت

اس زمانہ میں انسان کے نظریات بدنی اور جبلتی ضروریات کی سطح سے بالاتر ہو کر علمی اور اخلاقی سطح پر آ گئے ہیں لہٰذا نظریات کی حیثیت سے ان کی موجودگی پوری طرح سے نمایاں ہو گئی ہے۔ یہ زمانہ علمی نظریات کا زمانہ ہے۔ اس دور میں اسلام کے سوا باقی تمام نظریات کے قائلین اپنے اپنے نظریات کی علمی اور عقلی توجیہہ اور مدافعت بہم پہنچانے میں مصروف ہیں۔ کیونکہ وہ یہ محسوس کر رہے ہیں کہ اگر وہ ایسا نہ کریں گے تو ان کی سیاسی زندگی بلکہ ہر قسم کی زندگی خطرہ میں رہے گی۔ نظریہ جو دراصل انسان اور کائنات کی حقیقت کے متعلق ایک مشاہدہ یا وجدان یا ایمان کا نام ہے، تنہا وہ قوت ہے جو فرد اور جماعت اور ریاست کے تمام اعمال و افعال پر حکمران ہے۔ اگر یہ ثابت کیا جا سکے کہ وہ نظریۂ حیات جس پر کسی ریاست کی بنیاد رکھی گئی ہے، علمی طور پر صحیح اور عقلی طور پر اعتراضات سے بالا ہے تو اس سے دو اہم نتائج برآمد ہوں گے۔ ایک یہ کہ اس سے ریاست کے ساتھ فرد کی کشش یا محبت بڑھ جائے گی اور ریاست کا اندرونی اتحاد ترقی پائے گا اور اس کی استعداد عمل میں اضافہ ہوگا اور اس کی قوت فروغ پا کر انتہا تک پہنچ جائے گی۔ اس کا دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ ریاست کی حدود کے باہر ریاست کے حامیوں اور مددگاروں کی تعداد روز بروز بڑھتی جائے گی اور اس طرح سے اس کے سیاسی اثر و نفوذ کا حلقہ روز بروز وسیع ہوتا جائے گا۔ جس قدر کوئی نظریہ حیات زیادہ معقول و مدلل ہوگا اور جس قدر زیادہ دلکش اور دلنشیں ہوگا اسی قدر زیادہ امکان اس بات کا ہوگا کہ وہ ترقی پا کر زمین کے کناروں تک پھیل جائے اور وہاں ہمیشہ کے لیے موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نظریہ کے ماننے والے اس بات کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس کی ایک بلند پایہ علمی اور عقلی تشریح پیدا کریں۔ اشتراکیت پہلے ہی ایک سائنسی نظریہ حیات ہونے کی مدعی ہے۔ ہٹلر کا نظریہ نیشنل سوشلزم اس کی کتاب ''میری جدوجہد'' میں ایک فلسفہ کے طور پر پیش کیا گیا تھا۔ یہ ہیگل کے اس نظریہ کی ایک تشکیل جدید تھی کہ ریاست ایک خدا ہے جو غیر محدود اختیارات رکھتی ہے اور اطاعت مطلقہ کی حق دار ہے۔ مسولینی کا نظریہ فسطائیت بھی اطالوی فلسفی کروچے کے فلسفیانہ نظام سے عقلی تائید اور توثیق حاصل کرتا تھا۔ امریکہ کے لوگ اب جمہوریت کو محض ایک طرز حکومت نہیں سمجھتے بلکہ ایک فلسفہ زندگی سمجھتے ہیں اور بعض امریکی مصنفین نے اسے

[۱] نامور فلسفی، مصنف، مسلم دانشور اور بانی صدر آل پاکستان ایجوکیشنل کانگرس، لاہور

ایک فلسفہ زندگی کے طور پر پیش کرنے کی کوشش بھی کی ہے۔ بھارت کے لوگ سمجھتے ہیں کہ ان کی ریاست گاندھی کے فلسفہ ندگی پر مبنی ہے۔

ایک نظریۂ حیات غلط ہو یا صحیح لیکن وہ لوگ جو اس سے محبت رکھتے ہیں یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی نظریہ حیات دنیا میں حق ہے یا حق ثابت کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے۔ جب وہ اس کی عقلی اور علمی توجیہ یا مدافعت کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کا مقصد درحقیقت یہ ہوتا ہے کہ وہ اس نظام حکمت کو آشکار کریں جو عقلی لحاظ سے دنیا کے تمام فلسفوں میں یکتا اور یگانہ ہے، جو صرف ان کے نظریۂ حیات کے اندر مخفی ہے اور دنیا بھر میں اور کہیں پایا نہیں جاتا۔ ہر نظریہ حیات کا ماننے والا اپنے نظریۂ حیات کے متعلق ایسا ہی خیال رکھتا ہے۔ لیکن چونکہ حق صرف ایک ہے اور یہ ظاہر ہے کہ صرف ایک ہی فلسفہ ایسا ہو سکتا ہے جو درحقیقت صحیح اور معقول ہو اور دو یا دو سے زیادہ فلسفے ایسے نہیں ہو سکتے اس کا مطلب صاف طور پر یہ ہے کہ اپنی اپنی سائنسی توجیہ اور تشریح کرنے کے لیے نظریات کی دوڑ میں صرف ایک نظریۂ حیات کامیاب ہوگا اور وہی نظریۂ حیات زندہ رہے گا اور پوری دنیا پر چھا جائے گا اور باقی نظریات مٹ جائیں گے اور زندہ رہنے والے اس نظریہ حیات کے متعلق یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جائے گی کہ یہی انسان اور کائنات کا وہ آخری صحیح فلسفہ ہے جو عقل انسانی کی صبح کے طلوع سے لے کر آج تک تمام فلسفیوں اور سائنس دانوں کا سہانا خواب اور ان کی جستجو کا گوہر مقصود بنا رہا ہے۔ یہ باور کرنے کے لیے ہر دلیل موجود ہے کہ صرف اسلام ہی ایک ایسا نظریہ حیات ہے جو اس قابل ہے کہ انسان اور کائنات کی ایک عقلی، علمی اور سائنسی تشریح کی صورت اختیار کر سکے لیکن اب تک ہم نے کون سا کام کیا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہو جائے کہ ہمارا یہ عقیدہ فی الحقیقت درست ہے۔ اس معاملہ میں ہماری غفلت کو اس حقیقت نے اور زیادہ سنگین اور خطرناک بنا دیا ہے کہ دوسرے نظریات کو ماننے والے لوگ اس وقت بھی دنیا کے اوپر یہ ثابت کرنے کے لیے بہت سا کام کر چکے ہیں کہ صرف ان کے نظریات ہی معقول اور مدلل ہیں اور دنیا کا تعلیم یافتہ طبقہ یعنی نوع انسانی کا وہ حصہ جو درحقیقت کوئی اہمیت رکھتا ہے اور جس میں تعلیم یافتہ مسلمان بھی شامل ہیں، ہر روز زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے ہمرنگ زمیں دام میں گرفتار ہوتا جا رہا ہے۔

اسلامی تحقیق کا کام ہمارے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے

اقوام عالم ایک باہمی جنگ میں مصروف ہیں جو کبھی پرامن ہوتی ہے اور کبھی تشدد آمیز لیکن یہ ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس جنگ میں نظریات اور تصورات کی قوت ہی فیصلہ کن ثابت ہوگی۔ جو

قوم اس جنگ میں فتح یاب ہو کر بالآخر دنیا کے کناروں تک پھیل جائے گی اور پھر ہمیشہ وہاں موجود رہے گی، یہ وہ نہیں ہوگی جس کے پاس جوہری آلات زیادہ ہوں گے، بلکہ وہ ہوگی جس کے نظریہ حیات کے تصورات سب سے زیادہ معقول، مدلل، دلکش اور دل نشیں ہوں گے۔ جو قوم نظریاتی محاذ پر اپنی حفاظت نہیں کرتی وہ محض فوجی محاذ پر طاقتور بن کر اپنے آپ کو بچا نہیں سکتی اور جو قوم نظریاتی محاذ پر طاقتور بن جائے اسے کسی فوجی محاذ کی ضرورت نہیں رہتی۔ اپنی زندگی کے اس نازک دور میں جب ہم دوسری قوموں کے نظریات کی طرف سے اپنی بقاء کے لیے ایک خطرناک چیلنج کا سامنا کر رہے ہیں، ہم ایک نظریاتی قوم کی حیثیت سے صرف اسی صورت میں زندہ رہ سکتے ہیں، جب ہم اسلام کی ایک نہایت ہی معقول اور مدلل سائنسی توجیہہ پیش کریں۔ ہماری خوش قسمتی ہے کہ تمام معقول اور دلکش سائنسی تصورات کا سرچشمہ توحید کا عقیدہ ہے جو اپنی صحیح اور پاکیزہ صورت میں فقط مسلمان قوم ہی کے پاس ہے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو اسلام کی روح ہے اور انسان اور کائنات کے صحیح اور سائنسی نظریہ کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم تحقیق و تجسس کی تمام قوتوں کو بروئے کار لا کر اسلامی تعلیمات کو ایک ایسے سائنسی نظریۂ کائنات کی شکل دیں جس سے انکار کی گنجائش موجود نہ رہے۔ ہمارے اسلامی تحقیق کے تمام اداروں کو اس اہم کام کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اسلامی تحقیق ہمارے لئے کوئی غیر ضروری تفریحی مشغلہ نہیں جسے ہم اپنی فرصت یا سہولت کے مطابق اختیار کریں بلکہ یہ ہماری زندگی اور موت کا سوال ہے۔ اگر ہم اس کی طرف بروقت اور پوری تن دہی کے ساتھ متوجہ نہ ہوئے تو ہمیں یقینی موت کا منتظر رہنا چاہیے اور پھر ہمارے بعد خدا کوئی اور قوم پیدا کرے گا جو اسلام کا یہ کام کرے گی۔

ہم اپنے آپ کو غلط نظریات کا معتقد بننے سے کیونکر بچا سکتے ہیں؟

اس دور میں یہ حقیقت پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ افکار اور تصورات قوموں کو مفتوح اور مغلوب کرنے والی ایک قوت کی حیثیت سے افواج اور اسلحہ کی تمام قسموں سے زیادہ موثر ہیں چونکہ وہ لاسلکی پر بھی سفر کر سکتے ہیں۔ وہ افواج اور اسلحہ سے بہت زیادہ سریع الحرکت ہیں اور پہاڑوں، دریاؤں، سمندروں اور صحراؤں کی جغرافیائی رکاوٹیں، بین الاقوامی سیاسی سرحدیں اور فوجی مدافعتی قلعہ بندیاں ان کی یلغار کو روک نہیں سکتیں۔ ہر ریاست ایک منظم نظریاتی جماعت ہوتی ہے۔ جو اپنے پریس، پلیٹ فارم، ریڈیو، سینما اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ سے اور اپنی مطبوعات اور دوسرے ملکوں میں قائم کئے ہوئے اطلاعاتی مرکزوں اور کتب خانوں کی مدد سے اپنے نظریہ کی معقولیت اور دلکشی کو ثابت کرنے والے تصورات کی اشاعت کرتی رہتی ہے تاکہ

دوسری قوموں کو ذہنی اور نفسیاتی طور پر مفتوح اور مغلوب کرے۔ وہ نظریاتی جماعت جو دوسری نظریاتی جماعتوں کو اپنے تصورات سے مفتوح اور مغلوب کرنے کی کوشش نہیں کرتی۔ اس بات کا خطرہ مول لیتی ہے کہ زود یا بدیر دوسری نظریاتی جماعتیں اسے مفتوح اور مغلوب کر کے ہمیشہ کے لیے صفحہ ہستی سے مٹا دیں گی۔ حقیقت حال یہ ہے کہ نظریات کی اس جنگ کے میدان کے عین وسط میں موجود ہونے کے باوجود ہم عرصہ دراز سے نہ دوسروں کو اپنے تصورات سے متاثر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور نہ دوسروں کے تصورات کے بالمقابل اپنی مدافعت اور حفاظت کر رہے ہیں، بلکہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہم اس بات کے بہت قریب پہنچ گئے ہیں کہ ہم دوسری قوموں کے تصورات سے ذہنی طور پر مفتوح اور مغلوب ہو کر مسلمان قوم کی حیثیت سے نیست و نابود ہو جائیں۔ ظاہری طور پر ہم میں سے بیشتر ایسے ہیں جن کے دلوں میں اسلام کی بجائے دوسرے نظریات کی محبت متمکن ہے۔

جس نسبت سے ہم دوسرے تصورات اور نظریات کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ اسی قدر اسلام سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ بداخلاقی، فریب کاری، بے حیائی، رشوت ستانی، خود پرستی، جنبہ داری، خاندان پرستی، صوبہ پرستی، چور بازاری، نفع اندوزی اور دوسری بری خصلتیں جو ہمارے معاشرہ میں روز افزوں ترقی پر ہیں اور جن پر ہم میں سے بعض اچھے لوگ اظہار افسوس کرتے رہتے ہیں، سب اس بات کی علامت ہیں کہ اسلام پر ہمارا ایمان مضمحل ہوتا جا رہا ہے۔ اسلام پر ہمارے یقین و ایمان کے انحطاط کی ایک اور علامت یہ ہے کہ اسلام کے متعلق ہمارے افہام پراگندہ اور ہمارے خیالات پریشان ہیں اور ہم یہ جاننے سے قاصر ہیں کہ اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے، کس قسم کی عملی زندگی کا مطالبہ کرتا ہے اور کیوں؟ غلط نظریات اور تصورات کی دھند اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ہمیں اپنا راستہ صاف طور پر نظر نہیں آتا۔ ان حالات میں کئی خود ساختہ رہبران قوم، جو غیر اسلامی نظریات کے دام میں دوسروں سے کم گرفتار نہیں، اسلام کی نئی تشریح کرنے کے لیے سامنے آ گئے ہیں۔ گویا وہ اپنی غیر معمولی خداداد ذہانت اور قابلیت سے اسلام کو اس کی موجودہ مشکلات سے نجات دے کر مسلمان پر احسان کرنا چاہتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اسلام کی کئی متضاد قسم کی توجیہات وجود میں آ گئی ہیں جن سے ہماری پراگندہ خیالی اور بڑھ رہی ہے اور اس اسلام پر ہمارا ایمان اور کمزور ہوتا جا رہا ہے جس پر تاریخ کی ناقابل انکار شہادتوں کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہؓ نے عمل کیا تھا۔ اس صورتحال نے بعض مخلص مسلمانوں کو بڑا پریشان کر دیا ہے اور وہ اس بات کی کوشش کر رہے ہیں کہ اسلام سے بھٹکنے والے مسلمانوں کو خدا،

رسول اور قرآن کا واسطہ دے کر اسلام کی طرف واپس لایا جائے۔لیکن ان کی کوششوں کے باوجود یہ مسلمان اسلام سے روز بروز دور تر ہوتے جا رہے ہیں۔ یہ کوششیں جو درحقیقت بے یقین مسلمانوں کی مشکلات سے بے خبری پر مبنی ہیں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں۔ہمیں اس بات کو واضح طور پر سمجھ لینا چاہئے کہ وہ مسلمان جو اسلام پر اپنا یقین کھو بیٹھتا ہے وہ اپنے افکار وتصورات غیر اسلامی نظریات سے عقل،علم، دانش اور سائنس اور فلسفہ کے دلفریب ناموں کے ساتھ مستعار لیتا ہے۔لہٰذا جب تک ہم اسلامی تحقیق کے ذریعہ سے ایسا علمی اور عقلی ذخیرہ پیدا نہ کریں جو اس کے غیر مسلم استاد کو اسلام کے حق میں پوری طرح سے متاثر کر سکے ناممکن ہے کہ ہم اس کو اسلام کی طرف واپس بلا سکیں۔

غیر مسلم کو اسلام کا معتقد بنانے کا طریقہ

لیکن ایک غیر مسلم کے سامنے اسلام پیش کرنے کا طریق اس سے بہت مختلف ہے جو ایک مسلمان فرد کے لیے کام میں لایا جا سکتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک معلم یا مبلغ کی حیثیت سے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم مخاطب کے معلوم سے آغاز کر کے اس کے نامعلوم کی طرف آئیں اور ظاہر ہے کہ ایک مسلمان کا معلوم ایک غیر مسلم کے معلوم سے بہت مختلف ہے۔مثلاً ایک مسلمان جانتا ہے کہ قرآن حکیم خدا کی نازل کی ہوئی سچی کتاب ہے۔ایک غیر مسلم یہ نہیں جانتا۔وہ صرف قدرت کے ان حقائق اور قوانین کو ہی جانتا ہے جو وہ قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے معلوم کر سکتا ہے اور ہم اس کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے فقط ان ہی حقائق اور قوانین کو بطور دلائل کے پیش کر سکتے ہیں۔اسلام کی تبلیغ کا یہ طریق نیا نہیں بلکہ یہ طریق بعینہ وہی ہے جو خود قرآن حکیم نے اختیار کیا ہے۔کیونکہ قرآن حکیم منکرین کو بار بار اس بات کی دعوت دیتا ہے کہ وہ خدا پر ایمان لانے کے لیے مظاہر قدرت کا مشاہدہ اور مطالعہ کریں جہاں ان کو خدا کی ہستی اور صفات کے واضح نشانات نظر آئیں گے اور ایسے حقائق کی بنا پر خدا کی نازل کی ہوئی کتاب ہونے کا مدعی ہے جو قدرت کے مشاہدہ اور مطالعہ سے دریافت کئے جا سکتے ہیں۔ بلکہ قرآن حکیم اس بات کی پیش گوئی کرتا ہے کہ خدا مستقبل میں خارجی دنیا اور نفس انسانی سے تعلق رکھنے والے ایسے حقائق کو آشکار کرے گا جن کی روشنی میں منکرین یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوں گے کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے۔ اب یہ بات مسلم ہے کہ سائنس اور سائنسی طریق تحقیق یعنی مظاہر قدرت کا علم اور اس کے حصول کے طریق کے موجد مسلمان تھے۔ظہور اسلام کے بعد مسلمان سائنسدانوں کے ذریعہ سے مشاہدۂ قدرت کی ضرورت کے بارے میں قرآن کی رہنمائی سے مستفید ہو کر ایک عرصہ سے مغرب کے

لوگ مظاہر قدرت کا تفصیلی اور تحقیقی مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے اب ایسے حقائق کا ایک بہت بڑا ذخیرہ جمع کرلیا ہے جو مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھتے ہیں اور ان حقائق کو انہو ں نے کئی منظم علوم کی صورت میں مرتب کیا ہے جن کے مجموعہ کو سائنس کہا جاتا ہے۔ قدرت کے جو حقائق مادہ، حیوانات اور انسان سے تعلق رکھتے ہیں ان کو بالترتیب طبیعیات، حیاتیات اور نفسیات کا نام دیا گیا ہے۔

غیر مسلموں کی کوتاہی

مغرب کے غیر مسلموں نے بے شک مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے بہت سے حقائق کو بڑی احتیاط اور محنت سے دریافت کر کے مختلف علوم کی صورت میں مرتب کر لیا ہے لیکن بدقسمتی سے وہ نہیں سمجھ سکے کہ ان حقائق کا حقیقت کائنات کے ساتھ اور ایک دوسرے کے ساتھ کیا تعلق ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ وہ حقائق کسی عقلی اور علمی ربط کے بغیر ایک دوسرے سے الگ تھلگ پڑے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اہل مغرب اور مظاہر قدرت کے علم کے متعلق ان کے نقطۂ نظر سے متاثر ہونے والی قوموں کے نصب العینوں یا نظریہ ہائے حیات یا نظام ہائے حکمت کے اندر بہت زیادہ اختلاف موجود ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس حقیقت کو بالعموم درست سمجھا جاتا ہے کہ مظاہر قدرت کے علم سے تعلق رکھنے والے حقائق جن کو عام فہم زبان میں سائنسی حقائق کہا جاتا ہے، عقلی اور علمی نقطہ نظر سے حقیقت کائنات کے ساتھ مطابقت رکھتے ہیں اور ہر نظام حکمت اس کوشش سے عبارت ہوتا ہے کہ حقیقت کائنات کے ساتھ ان کے اس تعلق کو جو نظام حکمت کے موجد کی سمجھ میں آتا ہے واضح کیا جائے اور استدلال کی قوت سے پایہ ثبوت کو پہنچایا جائے۔ دوسرے لفظوں میں ہر نظام حکمت اس کوشش سے صورت پذیر ہوتا ہے کہ سائنسی حقائق کو ان کے علمی اور عقلی ربط وضبط کے ساتھ منظم کیا جائے۔ ایک نصب العین حقیقتِ کائنات اور اس کے اوصاف وخواص کا ایک تصور ہوتا ہے۔ ایک نظریہ حیات ایک مجموعہ تصورات ہوتا ہے جو کسی نصب العین سے ماخوذ ہوتے ہیں خواہ وہ عقلی اور علمی لحاظ سے منظم ہوں یا نہ ہوں لیکن ایک نظام حکمت یا فلسفہ ایسے تصورات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے جو کسی نصب العین کے ماتحت عقلی اور علمی لحاظ سے مربوط اور منظم کئے گئے ہیں۔

فلسفی کا طریق کار

فلسفی کو سب سے پہلے حقیقتِ کائنات کے متعلق ایک وجدان، ایقان یا مشاہدہ حاصل ہوتا ہے جو اس کے معلوم حقائق پر اس کے غور وفکر کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس کے خیال میں ان حقائق سے

مطابقت رکھتا ہے۔ پھر وہ کوشش کرتا ہے کہ حقیقتِ کائنات کے اس وجدانی تصور کے ساتھ معلوم حقائق کے علمی اور عقلی تعلق یا ربط کی وضاحت کرے۔ اس کوشش کے ذریعہ سے وہ دراصل اپنے وجدانی تصورِ حقیقت کی عقلی توجیہ کرتا ہے اور یہی توجیہ اس کا فلسفہ کہلاتی ہے۔ اگر اس کا وجدانی تصورِ حقیقت غلط ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہ بھی غلط ہوگی اور اس کے افکار وتصورات کی عقلی ترتیب اور منطقی تنظیم کے اندر جابجا ناہمواریاں اور نادرستیاں ابھر آئیں گی اور رخنے اور جھول پیدا ہوجائیں گے جن کو یا تو وہ نظر انداز کرے گا یا اپنے دلائل کے پردہ میں چھپانے کی کوشش کرے گا۔ اس قسم کے رخنوں اور جھولوں کا ظہور انسانی اور اجتماعی علوم میں مثلاً نفسیات فرد وجماعت میں اور سیاسیات، اخلاقیات، اقتصادیات، تعلیمات، فن، قانون اور تاریخ کے فلسفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہوتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ علوم براہ راست فلسفی کے نظریہ حقیقت پر، جس میں نظریہ انسانی بھی شامل ہے، مبنی ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ (جیسا کہ حکمائے مغرب خود تسلیم کرتے ہیں) مغرب میں نشوونما پانے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں ایک شدید قسم کا منطقی اور عقلی انتشار پایا جاتا ہے اور جب صورتحال یہ ہو کہ ایک طرف سے انسان کی حقیقت روحانی توجیہ کا تقاضا کرتی ہو اور دوسری طرف سے انسانی اعمال اور افعال کے مرغب حکماء انسان کی میکانکی اور مادی توجیہ پر مصر ہوں تو پھر کیسے ممکن ہے کہ مغرب میں پروان چڑھنے والے انسانی اور اجتماعی علوم میں انتشار موجود نہ ہو۔ اس کے برعکس اگر فلسفی کا وجدانی تصورِ حقیقت درست ہوگا تو اس تصور کی عقلی توجیہ کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام علمی حقائق آسانی کے ساتھ ایک دلکش تنظیم اختیار کرلیں گے اور ایک مکمل نظام حکمت کے اندر ایک ایسی مکمل منطقی ترتیب کے ساتھ آراستہ ہوجائیں گے جس میں کوئی رخنہ یا جھول موجود نہیں ہوگا۔

ہمارے اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے کا کام

یہ معلوم کرلینے کے بعد کہ صرف حقیقتِ کائنات کا صحیح تصور ہی کسی صحیح فلسفہ کی بنیاد بن سکتا ہے اور ایک فلسفی کے لیے اس کا ہونا یہاں تک ضروری ہے کہ اس کے بغیر اس کا سارا کام ناقص، لغو اور بے کار ہوکر رہ جاتا ہے۔ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ فلسفی حقیقتِ کائنات کا یہ صحیح تصور کہاں سے لائے اور کیسے حاصل کرے؟ خدا نے فلسفی کی اس شدید ضرورت کا سامان کارخانہ قدرت کے اندر بلاقیمت اور ایک گراں قدر عطیہ کے طور پر خود بخود مرحمت فرما دیا ہے اور وہ نبیٔ کامل صاحبِ قرآن جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تصورِ حقیقت ہے جسے آپ کا ہر مخلص پیرو آپ کی محبت اور اطاعت کے ذریعہ سے اپنا بنا سکتا ہے۔ ہمارے تمام اسلامی تحقیق کے اداروں کے سامنے کرنے

کا اہم کام یہ ہے کہ وہ دنیا کے سامنے یہ ثابت کریں کہ کائنات کے طبیعیاتی، حیاتیاتی اور نفسیاتی طبقوں سے تعلق رکھنے والے تمام سائنسی حقائق صرف اس وجدانی تصورِ حقیقت کے ساتھ پوری پوری مطابقت رکھتے ہیں جو قرآن حکیم پیدا کرتا ہے۔اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ غلط نظام ہائے حکمت یا فلسفے جو غیر مسلم کو اسلام کی طرف سے آنے سے روکتے رہتے ہیں اور مسلمان معتقد کے اعتقاد کو خاموشی سے سلب کرتے رہتے ہیں شکست کھا جائیں گے۔سائنسی حقائق کی حمایت اور تائید ان سے ہٹ کر اسلام کے لیے مہیا ہو جائے گی۔لہٰذا یہ فلسفے یقین افروز نہیں رہیں گے اور بے اثر اور بے کار بھی ہو جائیں گے اور ان کی بجائے ایک نیا صاف ستھرا صحیح، معقول اور مدلل فلسفہ جو کلیۃً اسلام کا موید ہوگا بلکہ جو خود اسلام ہی کی ایک حکیمانہ اور سائنسی تشریح اور تفسیر ہوگا، وجود میں آئے گا۔ یہ ہے وہ طریق جس سے ہم دور حاضر کے علم کو قرآن کی روشنی میں اغلاط سے پاک کر سکتے ہیں اور دنیا کے سامنے قطعی طور پر ثابت کر سکتے ہیں کہ صرف قرآن ہی کا عطا کیا ہوا تصورِ حقیقت صحیح ہے اور یہی ہے وہ طریق جس سے ہم غیر مسلم کو اس کی معلوم اور مسلم صداقتوں یعنی سائنسی حقیقتوں سے استدلال کر کے اس کے نامعلوم حقائق یعنی قرآن حکیم کی صداقت کے یقین کی طرف لا سکتے ہیں اور شک کرنے والے مسلمان کو کفر اور الحاد سے بچا سکتے ہیں اور پھر یہی ہے وہ طریق جس سے ہم اسلام کی وہ حکیمانہ اور سائنسی توجیہ وجود میں لا سکتے ہیں جس کے وجود میں آنے پر اس زمانہ میں ہماری زندگی کا دارومدار ہے۔

جب اسلام کی سائنسی توجیہ جو بیک وقت انسان اور کائنات کی سائنسی توجیہ بھی ہوگی۔ فی الواقع وجود میں آجائے گی تو وہی ہمارے لئے انسانی اور اجتماعی علوم کی تشکیل جدید کی صحیح اساس بھی ہوگی۔ وہ ہمیں اس قابل بنائے گی کہ ہم مغربی حکماء کی ان کوششوں میں کہ نام نہاد انسانی اور اجتماعی علوم کو سچ مچ کے علوم بنایا جائے، ان کی رہنمائی کر سکیں۔اس رہنمائی کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ کوششیں اب تک کامیاب نہیں ہو سکیں۔اصل بات یہ ہے کہ جب تک ہمارے تحقیقِ اسلامی کے ادارے نفسیاتِ فرد اور نفسیاتِ جماعت اور سیاست، اخلاق، فن تعلیم، اقتصادیات، قانون اور تاریخ کے فلسفوں کو از سرنو اسلام کے تصور حقیقت کی بنا پر اور اسلام کی ایک ہی ممکن سائنسی توجیہ کے اجزا اور عناصر کے طور پر مدون اور مرتب نہ کر لیں، یہ کہنا ہرگز ممکن نہ ہوگا کہ ان کا کام ابتدائی مرحلوں سے کچھ بھی آگے بڑھ سکا ہے۔ظاہر ہے یہ کام اس نوعیت کا ہے کہ ایک درجن حکماء کو کئی سالوں تک مصروف رکھ سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ ہمارے تحقیقِ اسلامی کے اداروں کو جو کام درپیش ہے وہ کتنا وسیع وعریض ہے۔

اسلام اور پاکستان /ڈائیلاگ ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری[1]

انتخابات پاکستان میں تحفظ اور غلبۂ دین کا ذریعہ ہیں

مدیر البرہان اور پروفیسر طارق بٹ کا موقف غلط ہے

ہم ڈاکٹر محمد امین صاحب کے بے حد شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ۲۰۱۸ء کے انتخابات کے ضمن میں اسلامی جماعتوں کو دی گئی تجاویز پر تبصرہ فرمایا۔ اس مضمون کا مقصد ان چند غلط فہمیوں کو رفع کرنا ہے جو مکالمہ کے نتیجہ میں سامنے آئی ہیں۔ یہ غلط فہمیاں نظری اور اصولی بھی ہیں اور عملی بھی (بالخصوص پروفیسر طارق بٹ صاحب کے مضمون میں)۔ ہم ان دونوں پہلوؤں پر چند معروضات پیش کریں گے۔

نظری غلط فہمیاں

سب سے بنیادی غلطی یہ کہ paradigm کا جو تصور مضمون میں موجود ہے وہ واضح نہیں۔ paradigm کے لغوی معنی "pattern" کے ہیں (Oxford Dictionary of Current English, Second Edition 1994, P 645)۔ اس لفظ کا تصوراتی استعمال Kuhn کے کام کے بعد سے عام ہوا اور Kuhn نے اس سے مراد وہ آفاقی منہج تصور لیا جو عرف عام میں سائنٹفک میتھڈ کہلاتا ہے اور سولھویں صدی سے عام ہوا۔ Kuhn کی رائے میں کسی paradigm میں انتشار اس کے عوامل (elements) کے تضادات کی وجہ سے رونما ہوتا ہے کسی خارجی paradigm کے تصادم کے نتیجہ میں نہیں۔ یہ واضح نہیں کہ ڈاکٹر امین صاحب Kuhn کے اس تصور کو قبول کرتے ہیں یا رَدّ۔ وہ اس تصور کو بکثرت استعمال کرتے ہیں لیکن اس کو problematise نہیں کرتے۔ اس کو قبول کرنے یا رَدّ کرنے کی کوئی نقلی یا عقلی دلیل مرتب نہیں کرتے۔

آج جو نظام (System) اور طرزِ زندگی (life world) عالمی طور پر غالب ہے وہ سرمایہ داری ہے۔ کھینچ تان کر اس نظاماتی اور طرزی غلبہ کو paradigmatic کہا جا سکتا ہے

[1] معروف دانشور، فلسفی، ماہر معاشیات، کراچی

کیوں کہ سرمایہ دارانہ عقائد کا بھی غلبہ ہے۔ سرمایہ دارانہ نظریات کا بھی غلبہ ہے۔ سرمایہ دارانہ معاشرت کا بھی غلبہ ہے اور سرمایہ دارانہ نظم اقتدار بھی عالمی سطح پر غالب ہے۔ اور یہ نظاماتی اور طرزی غلبہ اتنا عمیق ہے کہ اس کے نظاماتی جبر کو effectively چیلنج کرنے کا کوئی مقام (space) موجود نہیں رہا۔ یہ بات ان عسکری تحریکوں کی وقتی پسپائی سے واضح ہوتی ہے جو سرمایہ دارانہ نظم اقتدار کی سرحدوں پر اس سے نبرد آزما ہیں۔

لیکن سرمایہ دارانہ paradigm غیر تضادی نہیں۔ ہر سطح پر - اعتقاداتی، نظریاتی، معاشرتی، ریاستی - شدید سے شدید تضادات کا شکار ہے۔ پوسٹ ماڈرنسٹ آدرشوں نے اس کے کلیدی اہداف: آزادی، مساوات، حقوقِ انسانی، ترقی - کو لغو، مہمل اور عملاً ناقابل حصول ثابت کر دیا ہے۔ سرمایہ دارانہ علمیت اور نظم اقتدار ماحولیاتی تنزل (environmental degradation) سے نبرد آزما ہونے کی کوئی مربوط حکمت عملی مرتب کرنے سے قاصر ہے۔ عالمی سود اور سٹہ کے بازار ہر چند سال بعد ایسے بحرانوں کا شکار ہو جاتے ہیں جو سرمایہ دارانہ نظاماتی موت کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں اور جن سے نبرد آزما ہونے کی کوئی مربوط حکمت عملی سرمایہ دارانہ علمیت ترتیب دینے سے قاصر ہے۔ عالم گیر سطح پر سرمایہ کی حکم رانی کی اداراتی صف بندی عملاً ناممکن نظر آتی ہے اور غالب سرمایہ دارانہ قومی ریاستوں (امریکا، یورپ، چین، روس) میں مزاحمت اور کش مکش دنیا کو تیسری جنگ عظیم کی طرف کھینچے لیے جا رہی ہے۔

ان تضادات کو فروغ دے کر ہی entirely سرمایہ دارانہ نظم اور طرز زندگی کی تسخیر ممکن ہے۔ انتخابات کے ضمن میں ہم نے جو حکمت عملی مرتب کی ہے اس کا مقصد سرمایہ دارانہ نظم اور طرزِ زندگی سے مصالحت نہیں بلکہ سرمایہ دارانہ نظم اقتدار میں دراڑ ڈالنا ہے۔ جمہوریت سرمایہ دارانہ نظام کا لازمی جز و نہیں۔ وہ قدیم یونان اور روم میں موجود تھی اور فارابی تک نے جمہوریت کا ایک مبہم تصور پیش کیا۔ یہ درست ہے کہ لبرل اور اشترا کی سرمایہ دارانہ نظم اقتدار نے جمہوری عمل سے استفادہ کیا ہے لیکن سرمایہ دارانہ اقتدار کو قائم رکھنے کے لیے لازم ہے کہ وہ ریپبلک رہے، جمہوریت ضروری نہیں۔ جمہوری عمل بالخصوص انتخابات کا استعمال سرمایہ دارانہ نظم اقتدار کو متزلزل کرنے کے لیے کیا جا سکتا ہے اور کیا گیا ہے (مثلاً الجزائر ۱۹۹۰ء ایران ۱۹۸۹ء اور ۱۹۹۷ء اور مصر ۲۰۱۴ء)۔ یہ بات صرف انتخابات کے لیے نہیں بلکہ کئی سرمایہ دارانہ اداروں (اسکولوں، ٹریڈ یونینوں، لوکل حکومتوں اور بالخصوص عسکری ٹیکنالوجی) کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

ان تمام ادارتی صف بندیوں کا استعمال خلاف اولیٰ لیکن حلال ہے بشرطیکہ اس استعمال کا مقصد سرمایہ دارانہ طرز اور نظام کا استحکام نہیں اس کی تسخیر ہو۔

انتخابات میں حصہ لینے کو جائز اہل سنت، اہل تشیع اور جمہور اکابرین نے دیا ہے (مثلاً مولانا محمود حسن، مولانا مدنیؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا اشرف علی تھانویؒ، مولانا داؤد غزنویؒ، مولانا مودودیؒ، امام خمینی، امیر ملت پیر جماعت علی شاہؒ، امام حسن البناؒ، حضرت حسن نصر اللہ، مفتی محمد شفیعؒ، مفتی محمودؒ وغیرہ)۔ ان فتاویٰ کو ردّ کرنے کی کوئی نقلی دلیل ڈاکٹر امین صاحب پیش نہیں فرماتے۔

وہ علما کرام اور صوفیہ عظام جو انتخابی عمل کی تصدیق فرما کر اس میں شمولیت اختیار کرتے ہیں بالکل راسخ العقیدہ اور مخلص فی الدین ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی الوہیت انسانی یا دیگر سرمایہ دارانہ عقائد پر ایمان نہیں لایا۔ سب سرمایہ دارانہ معاشرت کو ذلت اور گمراہی کہتے ہیں۔ ان میں سے کسی نے بھی سرمایہ دارانہ نظام اقتدار میں شمولیت اختیار نہیں کی۔

اس سے ثابت ہوا کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان انتخابات میں حصہ لے کر لازماً سرمایہ دارانہ فاسد عقائد قبول کرنے اور طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور نہیں ہو جاتا۔ وہ انتخابی عمل کو سرمایہ دارانہ نظم اقتدار کو منتشر کرنے کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے بشرطیکہ اس کو اس کا شعور ہو۔ ۲۰۱۳ء کے انتخابات میں تقریباً ۴ اعشاریہ ۳ کروڑ ووٹ پڑے اور یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ اس میں ۴ کروڑ ایسے افراد تھے جنہوں نے سرمایہ دارانہ اقدار کا کبھی نام بھی نہیں سنا اور جن کے سرمایہ دارانہ عقائد پر ایمان لانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ سب راسخ العقیدہ مسلمان اور راسخ العقیدہ علما اور مشائخ کے پیرو ہیں۔ ان میں سے ایک بڑی اقلیت شعائر اسلامی کے دفاع اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس پر کٹ مرنے کے لیے ہر وقت تیار ہے جیسا کہ جناب خالد جامعی نے البرہان کے جولائی ۲۰۱۷ء کے شمارہ میں ثابت کیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظاماتی اور طرزی غلبہ کے باوجود ہماری (اور بیشتر اسلامی ممالک کی) عوامی انفرادیت اور معاشرت اسلامی ہی ہے۔

بیسویں صدی میں ہمارے اکابر علما اور صوفیہ نے جو جمہوری نظام اقتدار کے ساتھ مصالحت کی اسی نے اس عوامی اسلامی انفرادیت اور معاشرت کو محفوظ رکھا ہے اور یہ کہنا تاریخی حقائق سے منہ موڑنا ہے کہ جمہوری عمل خواہ انتخابات اور اسمبلیوں کی صورت میں، خواہ پر امن شہری احتجاجوں کی شکل میں، ریاستی اقتدار کو متزلزل کر کے تحفظ دین کی راہ ہموار نہیں کرتا۔ آج یہ اسلامی سیاسی جماعتوں (بالخصوص جمعیت علمائے اسلام) کی جدوجہد ہی ہے جو مدارس و مساجد کو اقتداری

دست برد سے محفوظ کیے ہوئے ہے اور جس کی بنیاد پر عوامی قوت کو متحرک کر کے ہم شعائر اسلامی کا دفاع کر رہے ہیں۔

آج ضرورت اس کی نہیں کہ جو دفاعی سیاسی حکمت عملی علما اور صوفیہ نے وضع فرمائی اس کو ردّ کر دیا جائے۔ یہ ہوا تو ہم قوت اور اقتدار کی ریاستی کش مکش سے بالکل بے دخل کر دیے جائیں گے۔ وہ تمام فوائد جو ابھی تک اس حکمت عملی کو اختیار کر کے حاصل کیے گئے ہیں ضائع ہو جائیں گے اور سرمایہ دارانہ اقتداری غلبہ مستحکم سے مستحکم تر ہوتا چلا جائے گا۔ اقتداری کش مکش سے دست بردار ہو کر ہم سرمایہ دارانہ تحکم کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ علماء وصوفیہ نے جو دفاعی سیاسی حکمت عملی وضع فرمائی تھی اسی کی بنیاد پر ہم ایک اقدامی حکمت عملی وضع کریں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ جمہوریت یا انتخابات کوئی دین نہیں، دین تو سرمایہ داری ہے اور اس نے یقینا جمہوریت اور انتخابات کے اداروں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا ہے۔ جمہور علما کی رائے میں ان اداروں کو سرمایہ دارانہ نظام وطرزِ زندگی سے منقطع کیا جا سکتا ہے۔ اس رائے کے سب سے بلند بانگ مدعی مولانا مودودی اور مولانا شبیر احمد عثمانی ہیں۔ وہ جمہوری اور انتخابی جدوجہد کو غلبہ دین کا موثر ترین ذریعہ تصور کرتے ہیں۔

ہم اس رائے سے متفق نہیں اور ہماری رائے میں جمہوری اور انتخابی عمل میں شمولیت سے یقینا یہ خطرہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلامی انفرادیت اور معاشرت سرمایہ دارانہ انفرادیت اور معاشرت میں ضم ہو جائے۔ لیکن یہ لازم نہیں۔ ہم جمہوری اور انتخابی عمل کو جائز اور حلال مانتے ہیں اور نصوصِ صیحہ میں پائی گئی کسی ایسی نقلی دلیل سے واقف نہیں جو جمہوری یا انتخابی عمل کی شرکت کو حرام قرار دے۔ جمہوری اور انتخابی عمل ان لاتعداد مکروہات کے مثلاً مقننہ میں وضع قوانین کی پابندی، سیکولر ریاست کو ٹیکس کی ادائیگی، عسکری اور مواصلاتی سرمایہ دارانہ ٹیکنالوجی کا استعمال، ٹریڈ یونینوں میں شمولیت، جو سرمایہ دارانہ اقتداری تسلط کے نتیجہ میں ہم پر مسلط ہیں، ان جائز مکروہات سے اجتناب کے مواقع سرمایہ دارانہ نظاماتی اور طرزی غلبہ کے نتیجہ میں محدود سے محدود تر اور غیر موثر سے غیر موثر تر ہوتے جا رہے ہیں۔ لہٰذا اصل مسئلہ سرمایہ دارانہ اقتدار کو منتشر کرنے کا ہے، جب تک سرمایہ دارانہ اقتدار کمزور اور روبہ زوال نہ بنایا جائے گا تبلیغ، تعلیم، تربیت، تزکیہ نفس اور اصلاح کی تمام کوششیں سب سرمایہ دارانہ نظم اور طرز زندگی میں ضم ہوتی چلی جائیں گی۔ تبلیغ، تعلیم،

تزکیہ نفس اور اصلاح کی تمام مروجہ کوششیں سرمایہ دارانہ نظم اقتدار سے مصلحت خواہی کے طریقے ہیں۔ یہ بات صرف انتخابات میں مروجہ طریقہ شرکت کے بارے میں نہیں بلکہ تحفظ دین کے تمام مروجہ طریقوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تربیت اور تزکیہ نفس کا کام کیا وہ تین سال کے بعد ہی کفری اقتدار کے لیے ایک خطرہ کے طور پر عموماً پہچانا گیا۔ آپ نے مکہ میں قدیم زمانہ سے قائم ندوہ مقننہ کے اقتدار کو چیلنج کیا۔ اس میں آپ نے یا کسی اور مسلمان نے شرکت اختیار کبھی بھی نہ کی اور نہ ہی ندوہ کے احکامات کی تابع داری قبول کی۔ آپ شروع سے مسلمانانِ مکہ کے حکمران، شارع اور منتظم تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے اپنے ''خطباتِ بہاول پور'' میں تحریر فرمایا کہ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں state within a state قائم کی اور اسی state within a state کے بڑھتے ہوئے اقتدار نے کفار کو مسلمانوں کو تعذیب کا نشانہ بنانے پر مجبور کیا اور انہوں نے دس سال تک مسلسل مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑے۔ ہم بھی سلطنت مغلیہ کے سقوط کے بعد سے مسلسل تبلیغ، تزکیہ نفس، تربیت، تعلیم اور اصلاح کا کام کر رہے ہیں لیکن کبھی بھی کسی حاکم نے یہ محسوس نہیں کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام اقتدار کے لیے کوئی خطرہ ہے۔ اس کو برطانوی استعمار نے بھی ٹھنڈے پیٹوں برداشت کیا اور ہندوستان اور پاکستان کی سیکولر ریاستوں نے بھی کیوں کہ یہ غلبۂ دین کا کام ہے ہی نہیں۔ اس میں ریاستی قوت کے حصول کی جدوجہد کا سرے سے کوئی محرک موجود ہی نہیں اور جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مستقبل بعید میں یہ خود بہ خود (spontaneously) مزاحمتی صلاحیت پیدا کر دے وہ idealist خود فریبی کا شکار ہیں۔

اور تم سوائے شور کے کچھ بھی نہ کر سکو
کیا خوب لڑ رہے ہو کہ مارو نہ مر سکو

بلاشبہ تربیت، تعلیم اور تزکیۂ نفس کا جو کام ہو رہا ہے وہ نہایت اہم اور مفید ہے۔ اور اسی کی بدولت برصغیر میں اسلامی انفرادیت اور معاشرت بڑی حد تک محفوظ ہے لیکن یہ غلبہ دین کا کام نہیں اس سے سرمایہ دارانہ اقتدار کی تسخیر قطعاً ناممکن ہے۔ ہماری اور ہماری جماعت (جماعت اسلامی پاکستان) کی رائے میں تحفظ دین اور غلبہ دین کے کام میں ارتباط کی ضرورت ہے۔ تحفظ دین کی تحریکات (تبلیغی جماعت، دعوت اسلامی، مدارس دینیہ اور خانقاہی سلسلوں) کو غلبہ دین کے لیے جدوجہد کرنے والی اسلامی سیاسی جماعتوں کے مرشد، پشت پناہ اور خیر خواہ کا رول اختیار کرنا چاہیے۔ ان کو اس کا احساس ہونا چاہیے کہ انتخابی عمل سے پہلو تہی کوئی حقیقت پسندانہ آپشن نہیں

اوران کا جمہوری عمل سے اجتناب ہی وہ بنیادی وجہ ہے جو غلبہ دین کی کوششوں کو کمزور اور اسلامی حلقوں کی مایوسی (apathy) اور کفری اقتدار کا استحکام مستقل بڑھ رہا ہے۔

اے بھائی اگر تم ساتھ نہ دو تو ہم سے اکیلے کیا ہوگا؟

تحفظ اور غلبہ دین کے معاشرتی اور ریاستی اتحاد کو بروئے کار لانے کے ضمن میں ہم نے کئی مضامین لکھے ہیں جو ہماری ویب سائٹس www.fikremaududi.com اور www . rejectingfreedomandprogress.com پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان گزارشات کی مختصر تلخیص یہ ہے: اسلامی جماعتوں نے ابھی تک انتخابات کا انقلابی استعمال نہیں کیا۔اس کا مطلب یہ ہے کہ انتخابی عمل سرمایہ دارانہ اقتدار میں شمولیت کے لیے نہیں سرمایہ دارانہ اقتدار کو منتشر کرنے کے لیے استعمال کیا جائے۔اس اتحاد کو عوامی سطح پر بین المسالک مساجد کے وفاقوں کی صورت میں منظم کیا جائے۔اتحاد کا مقصد اور اس کے کام کے محور انہی بین المسالک مساجد کے اوقافوں کے محلہ کی سطح اور بازار کی سطح پر دائرہ اختیار میں توسیع ہو۔افتا،قضا اور محتسب کے اداروں میں جان ڈالی جائے اور فتاویٰ کے فیصلوں کی تنفیذی صلاحیت بڑھانے کی جدوجہد کے ذریعے امام مسجد واحد علاقائی قائد اور رہنما کے طور پر پہچان وایا جائے۔انتخابات میں شرکت کا مقصد ایسی ملک گیر بین المسالک مساجد کے اوقافی نظام کا تحفظ اور اس کے دائرہ کار میں توسیع ہو۔اسلامی پارلیمانی ارکان اپنی پوری توجہ اسی مقصد کے حصول کو دیں۔نظاماتی تحکیمی ذمہ داریاں قبول کرنے سے اجتناب کریں اور تمام دیگر ارکانِ مقننہ سے اشتراک عمل صرف اسی بنیاد پر ہو کہ اس اشتراک کے نتیجہ میں بین المسالک مساجد کے اوقافوں کے نظم اقتدار کا تحفظ اور فروغ ممکن ہو۔

ہم انتخابات میں حکومت میں شمولیت کے لیے اختیار کرنے کے خواہاں نہیں۔ہم انتخابات کو سرمایہ دارانہ نظم اقتدار کو کمزور کرنے اور ایک معاشرتی متبادل اسلامی نظام اقتدار کو مستحکم کرنے کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔اپنے مخصوص قومی حالات کے تناظر میں اسی حکمت عملی کو کسی نہ کسی انداز میں ایران اور ترکی کی اسلامی جماعتوں نے اور حزب اللہ نے لبنان میں اختیار کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں ان ممالک میں اسلامی اقتدار کچھ نہ کچھ مستحکم اور منظم ہوا ہے۔

عملی پہلو

محترم پروفیسر طارق رقم طراز ہیں کہ "۲۰۱۸ء کے انتخابات کے ضمن میں جو حکمت عملی

تجویز کی گئی ہے وہ کاغذی طور پر صحیح لیکن wishful thinking پر مبنی ہے''۔ یہ رائے پروفیسر بٹ صاحب نے بہتانوں کی ایک فہرست کی بنیاد پر قائم کی ہے جو حسب ذیل ہے:

۔جماعت اسلامی بھی عوام کی نظر میں ایک فرقہ ہے۔

۔جماعت اسلامی کی قیادت میں اخلاص،بصیرت اور علم موجود نہیں۔

۔تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کا تصور دین ناقص اور نامکمل ہے۔

۔مسلکی جماعتیں فرقہ واریت کو فروغ دیتی ہیں اور ان کا کوئی مستقبل نہیں۔

۔مولانا فضل الرحمان اپنی چند نشستوں کی قیمت وصول کرنے پر تلے بیٹھے ہیں۔

۔ان کو جماعت اسلامی پر شدید غصہ ہے۔

۔وہ جماعت کی ناکامیاں گنواتے رہیں گے اور جماعت کی کامیاب ہونے میں مدد نہیں کریں گے۔

۔وہ جماعت اسلامی کو دبائے رکھیں گے اور جہاں چاہیں گے اور جس قیمت پر چاہیں گے اس کو بیچ دیں گے۔

۔مولانا فضل الرحمان ملی یکجہتی کونسل کے ڈکٹیٹر بننے پر مصر ہیں۔وغیرہ وغیرہ۔

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے؟
تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفت گو کیا ہے؟

ہم تو ابھی تک پروفیسر طارق بٹ کو اسلامی جدوجہد کا حامی اور بہی خواہ سمجھتے تھے۔اگر ایسا ہے تو۔

ہوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو؟

ظاہر ہے کہ یہ بہتان سراسر غلط ہیں۔ جماعت اسلامی کوئی فرقہ نہیں۔ واحد غیر مسلکی دینی جماعت ہے جس میں دیوبندی، بریلوی، شیعہ، اہل حدیث سب عناصر پائے جاتے ہیں۔ جماعت کی قیادت نہایت مخلص، جفاکش اور زیرک ہے اور طویل المدت منصوبہ بندی ہمیشہ سے اس کا شعار رہا ہے۔ہم سب (بشمول ڈاکٹر محمد امین) جماعت اسلامی کے لوگ ہیں اور ہم نے ہی سطور بالا میں مستقبل کا یہ نقشہ پیش کیا ہے۔تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی کا تصور دین ہرگز نامکمل

نہیں۔ کس کو نہیں معلوم کہ مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الہندؒ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ کون نہیں جانتا کہ جہاد ۱۸۵۷ء کی قیادت بریلوی علما (مولانا مدراسی وغیرہم) نے فرمائی اور مولانا نورانی اور مولانا محمد الیاس (دعوت اسلامی) کے بانی ہمیشہ بریلوی زعما کے اس کے کردار پر فخر کرتے تھے۔ مسلکی جماعتیں کبھی اسلامی اتحاد میں رکاوٹ نہیں بنیں۔ وہ تمام دینی سیاسی اتحادوں کا حصہ رہیں۔ ان کا مستقبل نہایت روشن ہے۔ یہی جماعتیں ہماری فقہی، دینی اور تمدنی ورثہ کی امین ہیں اور ان کا معاشرتی اثر ونفوذ نہایت مستحکم اور مربوط ہے۔

سب سے زیادہ افسوس ان الزامات کو پڑھ کر ہوا جو مولانا فضل الرحمان پر لگائے گئے ہیں۔ مولانا کو ایک غلیظ، سازشی، مطلب پرست، مغلوب الغضب اور شاطر بتایا گیا ہے۔ مولانا فضل الرحمان سیاست دیوبند کے جانشین اور مولانا حسین احمد مدنی کے مخلص پیروکار ہیں۔ آپ مفتی محمود کے بطل جلیل اور ایک جید عالم دین ہیں۔ آپ پاکستان کی سب سے کامیاب اسلامی سیاسی جماعت کے رہنما ہیں اور آپ کی سیاسی جدوجہد کا اولین ہدف مساجد اور مدارس کے تنظیمی اور تعلیمی نظام کو سرمایہ دارانہ استعماری دست برد سے محفوظ رکھنا ہے اور آپ اور آپ کی جماعت کی مساعی جلیلہ کے نتیجے میں اسلام کے یہ قلعے مامون ومحفوظ ہیں۔ آپ کبھی قیادت کے حریص نہیں رہے اور تاریخ شاہد ہے کہ آپ مولانا نورانی کی ایم ایم اے اور ملی یکجہتی کونسل کی سربراہی کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ آپ نہایت وسیع القلب اور وسیع المشرب ہیں۔ سب کو ساتھ لے کر چلنے کی خواہش اور صلاحیت رکھتے ہیں اور کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں دی جاسکتی کہ آپ نے دانستہً کسی بھی اسلامی جماعت کو دھوکا دیا ہو یا نقصان پہنچایا ہو۔

چوں کہ مولانا فضل الرحمان پاکستان میں اسلامی گروہوں کے سب سے کامیاب اور بااثر قائد ہیں، اور آپ ہی کی زیر قیادت اسلامی اتحاد منظم ہوسکتا ہے لہٰذا سرمایہ دارانہ استعماری قوتیں آپ کی کردار کشی کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتیں۔ کتنے شرم کی بات ہے کہ البرہان جیسے جریدہ میں مولانا فضل الرحمان پر وہی الزامات اور بہتان دہرائے جارہے ہیں جو استعمار کے ایجنٹوں عمران خان اور اسفندیار ولی کی زبانوں پر ہر روز رواں رہتے ہیں۔

ہم جماعت اسلامی کے کارکن ہیں اور بحیثیت جماعت کے کارکن ہر راسخ العقیدہ اسلامی جماعت کے خادم، بہی خواہ اور حمایتی ہیں۔ ہمارے بزرگ مولانا معین الدین خٹک نے فرمایا تھا:

کہو ہر کارکن سے سب جتھوں کو اپنا گھر سمجھے
ہر ایک بھائی کو وہ اپنا حلیف و ہم سفر سمجھے

ہم اتحادِ اسلامی کے نقیب ہیں اور اس کے قیام کو غلبہ دین کے لیے لازمی تصور کرتے ہیں۔ ہمارے عظیم مرشد مولانا مودودی نے فرمایا تھا مغرب جاہلیت خالصہ ہے اور اس اجتہاد کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ہم سرمایہ دارانہ اقتداری نظم کو تہس نہس کرنے کا عزم رکھتے ہیں۔ دفاعی اور اقدامی اسلامی جماعتوں کا معاشرتی انتخابی اتحاد اس ضمن میں ایک اہم پیش رفت ثابت ہو سکتی ہے۔

فکر مودودی گروپ

نوٹ: اس مضمون کا جواب البرہان کے اگلے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں، ان شاء اللہ۔

بقیہ: دینی جدوجہد: نئی حکمتِ عملی کی ضرورت

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ قرآن حکیم کی طرف رجوع کیا جائے تو ڈاکٹر صاحب کی اس بات سے کس کو اختلاف ہے؟ یہ کام جیسا اور جس پیمانے پر ہونا چاہیے وہ واقعی نہیں ہو رہا تاہم جو لوگ یہ کام کسی نہ کسی انداز میں کر رہے ہیں ان کی حوصلہ افزائی ضروری ہے۔ بلاشبہ ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ قرآن حکیم کو پڑھے، سمجھے اور اس پر عمل کرے اور اہل علم کا فرض ہے کہ وہ اس کام میں اس کی مدد کریں تاہم اس کام کا مارٹن لوتھر کی تحریک سے کوئی تعلق نہیں اور نہ قرآن کو پڑھنے، سمجھنے اور اس پر عمل کی کوشش کرنے والا ہر عامی مسلمان فقیہ اور مجتہد ہوتا ہے کہ وہ اٹھ کر دینی معاملات میں رائے زنی کرنے لگے۔ یہ تو معمولی کامن سینس کی بات ہے کہ ہم علاج کروانے ڈاکٹر انعام اللہ صاحب کے پاس جائیں گے اور دین پوچھنے کسی عالم کے پاس۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ عالم بنانے کا نظام، نصاب اور طریق کار صحیح نہیں ہے تو اس نظام تعلیم کی اصلاح کی کوشش کیجیے اور صحیح طرز کے تعلیمی ادارے قائم کیجیے۔ اگر اس کام کا اس کے علاوہ کوئی اور حل بھی ہے تو ڈاکٹر صاحب وہ ہمیں ضرور بتائیں۔

اسلام اور پاکستان　　پروفیسر عاصم حفیظ[1]

پاکستان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ

''شکر ہے، لوگ نماز نہیں پڑھتے''

عنوان پڑھ کر ضرور آپ کی دینی حمیت جاگی ہوگی ۔لیکن ذرا ٹھہریئے ، میری تھوڑی سی گزارش بھی سن لیں ۔ میں آپ کی توجہ چند تلخ حقائق اور اسلام کے نام پر بننے والی مملکت پاکستان کے ایک معاشرتی المیے کی طرف دلانا چاہتا ہوں ۔

لاہور کے اہم علاقے برکت مارکیٹ چوک میں شادی ہالز کا ایک کمپلیکس "مغل اعظم" کے نام سے ہے ۔اس عمارت میں چار بڑے ہالز ہیں جن میں مجموعی طور پر ہزاروں لوگوں کی گنجائش ہے ۔ یہ مصروف ترین شادی ہالز ہیں جہاں ہر روز بکنگ ہوتی ہے ۔گزشتہ دنوں یہاں جانے کا اتفاق ہوا ۔نماز مغرب کا وقت گزرا جا رہا تھا ، گارڈ سے نماز کی جگہ پوچھی ۔ یقین مانیں ہزاروں افراد کی گنجائش رکھنے والے اس کمپلیکس میں نماز کی جگہ پر ایک وقت میں صرف چھ افراد نماز ادا کر سکتے تھے ۔ویسے نماز پڑھنے والے بھی آٹھ دس افراد ہی تھے جنہوں نے دو شفٹوں میں یہ فریضہ سرانجام دیا ۔ یہ سب ایک سوچ کی عکاسی ہے جو ہمارے معاشرے میں سرایت کر چکی ہے ۔ ہمارے ہاں شادی کے جو اوقات ہوتے ہیں ان میں اکثر ایک سے دو نمازیں آتی ہیں لیکن بڑے بڑے شادی ہالز میں نماز کے لیے چند افراد کی گنجائش ہوتی ہے وہ بھی کسی سٹور روم میں یا راہداری میں ۔ اکثر اوقات تو مصلہ دے کر کہا جاتا ہے کہ جہاں چاہیں پڑھ لیں ۔ دفاتر ، عوامی مقامات ، مارکیٹ ، شاپنگ مالز ، تفریحی مقامات ، شادی ہالز اور ہوٹلز وغیرہ میں نماز کی جگہ چھوٹی ہوتی ہوتی بہت سی جگہوں پر تقریباً ختم ہی ہو چکی ہے ۔

آپ یقیناً سوچ سکتے ہیں کہ جسے نماز پڑھنی ہو اسے قریبی مسجد جانا چاہیے ۔ آپ کی بات درست ہے لیکن عرض یہ ہے کہ پرائیوٹ دفتر میں کام کرنے والا اگر نماز پڑھنے کسی مسجد میں جائے گا تو پندرہ بیس منٹ جانے ، نماز کی ادائیگی اور واپسی کے لئے اتنا ہی وقت صرف ہوگا یعنی تقریباً 45 منٹ صَرف ہوں گے ۔ یہ سب سوچا تو جا سکتا ہے لیکن حقیقت میں کیا کوئی پرائیوٹ کمپنی اپنے ملازم کو دفتری اوقات میں دو نمازوں کے لئے ڈیڑھ گھنٹہ سے زائد دینے پر تیار ہوگی؟ دو ذاتی

[1] asimmas27@gmail.com

تجربات شیئر کروں گا۔خبریں گروپ کے چینل فائیو میں نوکری ملی تو انچارج سے نماز کے لیے بمشکل دس منٹ کی اجازت ملی۔وضو کر کے نماز کی جگہ کا پوچھا تو بتایا گیا کہ اس پانچ منزلہ عمارت میں یہ سہولت میسر نہیں۔باہر جانے پر ٹائم زیادہ لگتا تھا اس لئے نماز کے شوق کو دفتری اوقات سے پہلے یا بعد میں ایڈجسٹ کرنا پڑا۔ملک کے ایک اور معروف نظریاتی ادارے میں نوکری ملی تو خوشی تھی کہ یہاں نماز کا انتظام موجود ہے۔لیکن المیہ دیکھیں کہ اس مکمل طور پر ائیر کنڈیشنڈ عمارت کی چھت پر بنی مسجد میں سخت گرمی اور شدید سردی میں نماز کے لئے جانے کی ہمت کوئی کوئی ہی کرتا تھا۔جی ہاں! دفاتر اور کئی ہوٹلز و ہالز وغیرہ میں نماز کی جگہ بنائی تو جاتی ہے لیکن اسے سہولیات سے محروم رکھا جاتا ہے۔شدید موسم میں ان جگہوں پر نماز کی ادائیگی صرف باہمت لوگ ہی کر سکتے ہیں۔اگر آپ کبھی پنجاب سول سیکرٹریٹ جائیں تو محکمہ ہائیر ایجوکیشن کے لان میں سینکڑوں ملازمین ظہر و عصر کی نماز ادا کرتے نظر آئیں گے۔مئی جون میں ان ملازمین کو کھلے لان میں دھوپ میں نماز ادا کرنا پڑتی ہے جہاں پنکھے تک دستیاب نہیں ہوتے۔آپ ضرور سوچ رہے ہوں گے کہ ان ملازمین کو سیکرٹریٹ کی مسجد جانا چاہیے۔تو جناب یہ لوگ گرمی میں پیدل آدھ گھنٹہ آنے جانے میں صَرف کرنے کی بجائے دس منٹ شدید دھوپ میں نماز ادا کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔لیکن سوال یہ ہے کیا کبھی کسی افسر نے ان کے لئے سائے اور پنکھے جیسی سہولت فراہم کرنے کے بارے میں سوچا؟ شاید وہ سوچتے ہوں گے کہ ثواب کمانا ہے تو مشکلات بھی برداشت کریں۔

پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ صحافت میں شائد ابھی بھی باہر لان میں ہی دریاں بچھا کر نماز ہوتی ہوگی کیونکہ اس بڑی عمارت میں نماز کے لئے کوئی جگہ میسر نہیں۔جس نے سائے میں نماز پڑھنی ہے وہ جامع مسجد جائے جو کافی دور ہے۔اب کلاس کے وقفے سے دس پندرہ منٹ بچا کر نماز پڑھنے والے یا تو کلاس چھوڑیں یا پھر نماز کی قربانی دیں، فیصلہ آپ پر ہے۔شائد ہمارے معاشرے میں خاموشی سے یہ فیصلہ ہو چکا ہے کہ نماز کے لئے اول تو سہولت دینی ہی نہیں، اگر بار بار لوگ پوچھ رہے ہوں تو چھوٹی سی جگہ دے دیں، ہاں البتہ اسے سہولیات سے محروم ہی رکھنا ہے تاکہ زیادہ لوگ اس کے عادی ہی نہ ہو جائیں۔دارالحکومت کے معروف اسلام آباد ہوٹل میں اگر نماز پڑھنی ہو تو آپ کو تہہ خانے میں تنگ راہداریوں سے گزر کر سٹورز کے ساتھ ایک چھوٹے سے کمرے میں جانا پڑے گا جہاں وضو وغیرہ تک کی مناسب سہولت دستیاب نہیں ہے۔مانا کہ نماز ایک عبادت ہے ثواب کرنے والا خود اپنے لیے ہی کماتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ بڑے بڑے ہوٹلز، مالز اور شادی ہالز وغیرہ جہاں کے واش روم بھی ائیر کنڈیشنڈ ہوتے ہیں وہاں نماز کی جگہوں

سے یہ امتیازی سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ پوری عمارت کو سہولیات سے مزین کرنے والے نماز کی جگہ کو چھت پر بنا کر نمازیوں کو سخت ترین موسم کا مقابلہ کرنے کے لیے کیوں چھوڑ دیتے ہیں؟ بات تو عجیب سی ہے لیکن کیا ان بڑے ہوٹلز میں بارز کو بھی اسی طرح سہولیات سے عاری رکھا جا سکتا ہے؟؟ کیا صرف اس لئے کہ نماز کی جگہ سے کوئی نفع بخش فائدہ ممکن نہیں اس لئے اسے بنایا ہی نہیں جاتا یا پھر سہولیات سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح بڑی بڑی مارکیٹوں اور شاپنگ مالز میں جہاں لوگوں کو اکثر گھنٹوں گزارنا ہوتے ہیں وہاں دکانداروں اور خریداروں کے لئے نماز کا مناسب انتظام موجود نہیں ہوتا۔ دور کی مساجد میں ادائیگی کے لئے فی نماز کم سے کم ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے۔ اسی طرح ہاوسنگ اسکیموں میں مساجد کی تعمیر تو کی جاتی ہے لیکن سینکڑوں گھروں کے لئے صرف ایک دس پندرہ مرلے کی مسجد۔ شائد یہی وجہ ہے کہ نماز جمعہ کے وقت جب کچھ زیادہ لوگ ان مساجد کا رخ کرتے ہیں تو انہیں باہر سڑکوں پر اور گلیوں میں نماز ادا کرنا پڑتی ہے۔

یہ بھی ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ معاشرے میں نماز پڑھنے کا رجحان کم ہوا ہے، لوگ اس فرض کی ادائیگی کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے لیکن یہ بھی ماننا پڑے گا کہ نماز کی جگہ کی عدم موجودگی، مناسب نہ ہونا، سہولیات سے محرومی اور دوری کے باعث بھی بہت سے لوگ آہستہ آہستہ نماز سے دور ہو رہے ہیں۔ یقینا آپ سوچ رہے ہوں گے کہ رہائشی علاقوں میں تو گلی گلی مساجد ہوتی ہیں وہاں لوگ کیوں نہیں جاتے؟ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ لوگ نماز پڑھنا ہی چھوڑ گئے ہیں ورنہ آپ کو ہر تھوڑے فاصلے پر موجود یہ مساجد بھی ناکافی نظر آتیں۔ یقین نہ آئے تو کبھی نماز جمعہ، رمضان المبارک کے ایام اور خاص کر جمعۃ الوداع کے موقع پر دیکھ لیں جب ہر مسجد ہی بھری اور باہر سڑکوں پر نمازی نظر آتے ہیں۔ آپ چاہے ناراض ہوں لیکن مجھے یقین ہے کہ دفاتر، شادی ہالز، شاپنگ مالز اور ہاؤسنگ اسکیموں کے مالکان کے ذہنوں میں یہ سوچ کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوگی کہ " شکر ہے؛ لوگ نماز نہیں پڑھتے'' ورنہ اس سہولت کی فراہمی کے لئے بھی وسائل خرچ کرنا پڑتے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون.

یورپ کا ''سہما ہوا مذہب'' اور قانونِ توہینِ رسالت

یورپی ملک ہالینڈ کے ایک چرچ میں ہونیوالی ایک شرمناک حرکت نے عالمی میڈیا کی توجہ حاصل کی ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ تلبرگ شہر میں دو اداکاروں نے چرچ کے اعترافی باکس میں جنسی

عمل کی عکس بندی کی جس ویڈیو کو بعدازاں پورنوگرافی کی ویب سائٹس پر جاری بھی کیا گیا ہے۔ چرچ کے پادری نے ویڈیو سامنے آنے کے بعد پراسکیوٹر کو ان اداکاروں کے خلاف کارروائی کی درخواست کی لیکن عدالت نے پادری کے اس مطالبے کو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ اس" حرکت" سے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔ ملک میں توہین مذہب کا کوئی قانون موجود نہیں۔ چرچ حکام کی جانب سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ کم سے کم دیوار پھلانگ کر عمارت کے اندر داخل ہونے پر ہی گرفت کر لی جائے لیکن اسے بھی مسترد کر دیا گیا۔ چرچ کے پادری کا کہنا ہے کہ وہ اس فیصلے سے سخت ناخوش ہیں۔ انھوں نے اتوار کو اس حوالے سے اجتماعی معافی کے لیے دعا بھی کروائی۔ دلچسپ ترین پہلو یہ بھی ہے کہ اس خبر نے یورپ بھر کے چرچ حکام اور پادری حضرات کو پریشان کر دیا ہے۔ ایک تجویز یہ بھی سامنے آئی ہے کہ گرجا گھروں کے باہر" داخلہ ممنوع ہے" کے بورڈز لگا دیئے جائیں تا کہ بغیر اجازت اندر داخل ہونیوالوں کے خلاف" قانونی کارروائی" کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ لیکن اس حوالے سے پریشانی یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی چرچ آنیوالے عقیدت مند بھی کہیں رک نہ جائیں۔ پادری اس قسم کے واقعات پر ملکی قوانین سے کسی بھی قسم کی مدد حاصل کرنے میں قاصر رہے ہیں اور وہ صرف" اجتماعی معافی" کی دعا ہی کرا سکتے ہیں۔

اس واقعے سے آپ یورپ میں" مذہب اور عبادت گاہوں" کی بے سروسامانی اور اوقات کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ یعنی پوری کہانی میں اس" مذموم حرکت" کا تذکرہ نہیں بلکہ پادری اور چرچ حکام بے بس و لاچار دیکھائی دیتے ہیں۔ وہ حکام سے التجائیں کر بھی رہے ہیں تو دیوار پھلانگنے کے جرم، بغیر اجازت داخلے جیسے اقدامات پر جبکہ ایک مقدس مقام کی بے حرمتی اور زنا کاری جیسے جرم کا تذکرہ تک نہیں کیونکہ انہیں پتہ ہے کہ اس پر ملکی قوانین خاموش ہیں۔ قانون ان کی مدد نہیں کر سکتا اور پادری کی درخواست مسترد ہونا اس کی دلیل بھی ہے۔ ہمارے ہاں بھی مغربی ممالک سے فنڈز لیکر لابنگ کرنیوالی این جی اوز اور بعض میڈیا کے ادارے بھی آئے روز یہ مطالبہ کرتے رہتے ہیں کہ ملک سے توہین رسالت اور توہین مذہب کے قوانین فوری طور پر ختم کر دیئے جائیں۔ ہمارے ایک سابقہ گورنر اور بہت سے اعلی حکام تو انہیں" کالے قوانین" تک قرار دے چکے ہیں۔ کوئی بھی چھوٹا بڑا واقعہ ہو جائے تو ہمارے ہاں مغرب زدہ لبرل دانشوروں کا مطالبہ یہی ہوتا ہے کہ ایسے قوانین کو ہی ختم کر دیا جائے جن کے تحت مقدس شخصیات اور عبادت گاہوں کی توہین پر کارروائی کی جاتی ہے۔ ہالینڈ کا یہ واقعہ ان افراد کے لئے سبق آموز ہے کہ جہاں توہین مذہب

کے قوانین ختم کر دیئے جاتے ہیں تو وہاں پھر پادری دیوار پھلانگنے کے جرم کے تحت کارروائی کی بھیک مانگتے نظر آتے ہیں۔شائد آپ کو یاد ہو امریکہ میں ایک پادری ٹیری جونز نے با قاعدہ قرآن پاک جلانے کی تقریب منعقد کرنے کا اعلان کیا تھا۔ جب امریکہ نے مسلم ممالک کے شدید مطالبے اور سخت عالمی ردعمل کے باعث اسے روکنے کا فیصلہ کیا تو اسے ''عوامی مقامات پر آگ جلانے'' کے قانون کی خلاف ورزی پر روکا گیا تھا۔اس بدبخت نے اس وقت تو یہ مذموم حرکت نہیں کی لیکن بعد میں اس نے واقعی قرآن پاک کو ایک چرچ کے اندر جلایا تھا جسے کوئی بھی امریکی قانون نہیں روک سکا۔یعنی ٹیری جونز کو آگ جلانے سے روکا گیا۔اربوں مسلمانوں کی مقدس ترین کتاب اوران کے جذبات سے کھیلنے سے روکنے کا کوئی قانون موجود نہیں تھا۔بہت سے شہ دماغ ارض پاک میں بھی شائد ایسا ہی ماحول بنانا چاہتے ہیں۔جب قوانین ختم ہو جائیں تو پھر مقدس ترین ہستیوں کو گالی گلوچ اور گستاخی پر کارروائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔مساجد میں بھی کوئی شرارتی جوڑا کوئی" حرکت" کر جائے گا تو علمائے کرام بغیر اجازت اندر داخلے کی دلیل لیکر قانونی کارروائی کی بھیک مانگتے نظر آئیں گے۔کوئی قرآن پاک جلانا چاہے تو اسے روکنے کے لئے قانون نہیں ملے گا۔کسی نے توہین رسالت ﷺ کا ارادہ کرلیا تو اسے ترلے منتوں سے منانا پڑے گا یا پھر صرف ''اجتماعی دعا'' سے ہی دل کو تسلی دینی ہوگی۔ہالینڈ کا یہ واقعہ باعث عبرت ہے اور لمحہ فکریہ ہے ان نام نہاد دانشوروں کے لئے جو دن رات ملک سے توہین مذہب اور توہین رسالت کے قوانین ختم کرانے کے لئے راگ الاپتے رہتے ہیں۔

برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

میانمار(برما) کے بدھ حکمران روہنگیا مسلمانوں پر ظلم وستم کے جو پہاڑ توڑ رہے ہیں اس پر پاکستان کے عوام اور دینی جماعتیں اگرچہ احتجاج کر رہی ہیں لیکن ظاہر ہے اس سے مسئلہ حل نہیں ہوسکتا۔جب تک مسلم اُمہ کے اجتماعی ادارے (مثلاً OIC) فعال نہیں ہوں گے اور عالمی سطح پر ان کا وقار اور وزن نہیں ہوگا اور وہ پوری قوت سے مسلمانوں کے تحفظ کے لیے متحرک نہیں ہوں گے،ان سے کسی نتیجہ خیز اقدام کی توقع نہیں ہوسکتی۔ یا اللہ! برما کے مظلوم مسلمانوں پر رحم فرما اور ان کی دستگیری کے لیے غیب سے کوئی انتظام فرما۔آمین

اسلامی تحریکیں

ڈاکٹر انعام اللہ [1]

دینی جدوجہد: نئی حکمتِ عملی کی ضرورت

[البرہان کا تبصرہ مضمون کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں]

مروجہ دین اسلام میں دورِ رسول کے عین مطابق اصلاح کی تحریک ناگزیر ہے۔ یہ تحریک مسلم اجتماعیتوں میں جنم لے رہی ہے۔ تبلیغی جماعت ہو، جماعت اسلامی ہو، جمعیت علماء اسلام ہو یا القاعدہ، سوچ بچار کرنے والے مسلم نوجوان اپنی ان اجتماعیتوں میں رہتے ہوئے ایک نئی صف بندی کر رہے ہیں۔

یہ تحریک، پاپائیت کے خلاف مارٹن لوتھر کی سولہویں صدی کے شروع میں احتجاجی تحریک کے مماثل ہے۔ اس تحریک میں پیرانِ کلیسا کی حیثیت، اہمیت، استحقاق اور نبیوں کی وراثت کے زعم کو چیلنج کیا گیا تھا اور عام عیسائیوں کو براہِ راست بائبل سے استفادہ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

ایسا ہی چیلنج آج سے ایک صدی پہلے روایتی اسلام کے پیروکاروں کو پیش کیا جا چکا ہے۔ یہی اس اصلاحی تحریک کی ابتداء ہے۔

ان بچاروں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق
خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

مذہبی پیشوائیت کے روایتی بُت نے ٹوٹنا ضرور ہے۔ فساد دنیا میں ہو یا ملک میں اس فساد کی سب سے بڑی ذمہ داری نبی کے وارثوں نے ہی اٹھانی ہے۔ اگر فرد، معاشرہ اور ریاست دین سے دُور ہو رہے ہیں تو اس مغلوبیت کی سب سے بڑی ذمہ داری دین کے ان نام نہاد محافظوں پر ہی آتی ہے جو بڑے بڑے اداروں میں ٹھاٹھ باٹھ کے ساتھ بغیر کسی احتساب کے زندگیاں گزار رہے ہیں جبکہ اللہ کی مخلوق کی اکثریت دینی اعتبار سے بھی تہی دست ہے اور معاشی اور اخلاقی اعتبار سے بھی۔

---

[1] سٹریٹ ۱۴، دارالسلام کالونی، اٹک شہر

ہمارے دین کا خلاصہ یہی ہے کہ انسانوں کو انسانوں کی غلامی سے نکال کر انسانوں کے رب کی غلامی میں لانا ہے۔ ان میں سے بدترین غلامی مذہبی پیشہ وروں کی غلامی ہے کہ ایسی غلامی خدائے پاک پر یقین کو متزلزل کر دیتی ہے۔

غلامی　سے　بدتر　ہے　بے　یقینی

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کام اپنے معاشرے اور اپنے دور کو غلط خداؤں سے پاک کرنا تھا۔ اس دور میں بھی جماعتیں، تنظیمیں، فرقہ واریتیں اور پیر پرستیوں نے اعتقادی بتوں کا روپ دھار لیا ہے۔ تبدیلی ایک واحد مستقل عمل ہے جس کی لہر نے دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔

ہمیں ربّ کائنات سے امید ہے کہ تبدیلی کا یہ عمل حق کی فتح پر منتج ہوگا۔ خبیث کو طیب سے جدا (متمیز) کر دیا جائے گا اور دورِ رسول کا دین پھر لوٹ آئے گا۔

اس تبدیلی یا تحریک کے لیے سب سے اہم واحد عمل انسانوں کو ربّ کائنات کی ’’الکتاب‘‘ سے جوڑنا ہے تاکہ اس کی ’’محکمات‘‘ کر حرزِ جاں بنا کر ایک جیسی نفسیات کے کروڑوں افراد دنیا میں موجود ہوں جو معاشروں اور ریاستوں کے سدھار میں معاون ہو سکیں۔

اس وقت کی موجود اجتماعیتوں میں سے انسانوں کو ربّ کائنات سے جوڑنے کے لیے خال ہی کوئی تنظیم ہو ورنہ ریاستیں ہوں یا جماعتیں، پیر خانے ہوں یا تعلیمی ادارے، اس کتاب کو مرکزی حیثیت دلانے والے عنقا ہیں۔

اسی کتاب نے ہمیں بتایا تھا کہ تین قدریں اور تین محبتیں دنیا کے تمام رشتوں اور اثاثوں پر فائق ہیں۔ یہ محبتیں، اللہ، اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اللہ کے راستے میں جہاد ہے۔ ان محبتوں کا مقصد اس دنیا میں توازن، نظام قسط، سلامتی اور امن کا قیام ہے۔

دنیا کے فرعونوں، قارونوں، ہامانوں اور آذروں نے اللہ کے راستے میں جہاد پر دہشت گردی کا لیبل لگوا کر ہمارے دلوں سے اس کی محبت کھرچ ڈالی۔ دین کے بڑے بڑے علمبردار اپنی جان بچا کر اور اپنے ادارے اور جماعتیں بچا کر اس نشے میں مخمور ہیں کہ ہم نے دین کو بچا لیا ہے۔ اسی بے حسی کی وجہ سے منافقین اور کفار کو یہ جرأت ہوئی کہ وہ توہین رسالت پر اتر آئے۔ اب یہی دین کے علمبردار ’’توہینِ عدالت‘‘ یا ’’توہینِ جمہوریت‘‘ پر تو غیظ و غضب کا شکار ہو جاتے ہیں۔ جبکہ ’’توہینِ رسالت‘‘ پر انہیں سانپ سونگھ جاتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ پاکستانی قوم انتشار (Turmoil) کا شکار نہیں بلکہ صریح انکار (Denial) کا شکار ہے۔ حقیقت یہی ہے کہ ہم اب تک یہ سوچنا ہی نہیں چاہتے کہ غلطیاں کہاں کہاں کی گئیں اور کیسے کیسے کی گئیں؟

پہلے غلطیاں تسلیم کی جائیں تو پھر ہی سوچا جاسکتا ہے کہ ان کا ازالہ کیسے کیا جائے؟ کچھ فوری نوعیت کے ازالے اور کچھ کو لمبا عرصہ درکار ہو سکتا ہے۔

سب سے پہلے غلطی تو یہ تھی کہ ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا الہ الا اللہ'' کے وعدے سے انحراف کیا گیا۔ پاکستانی جمہوری حکمران اب اپنا مستقبل ''آزاد خیالی'' (Liberalism) میں دیکھتے ہیں۔ اس وعدہ خلافی سے فوری رجوع بحیثیت قوم ضروری ہے۔

دوسری بڑی غلطی نائین الیون کے بعد صلیبی جنگ (Crusade) کی ڈگڈگی کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کو اس ملک سے دیس نکالا دے دیا گیا۔ اسی تذبذب نے منافقین اور کفار کو یہ شہ دی کہ وہ ناموس رسالت پر گستاخانہ حملوں کی جسارت کر سکیں۔

یہ ''دیوانوں کی بڑھک'' ہوسکتی ہے کہ اس دنیا سے مجاہدین یا جہاد کو ختم کر دیا جائے۔ جہادیوں کو وقتی طور پر ہرایا تو جاسکتا ہے لیکن ان کی آئندہ آنے والی نسلوں کو کبھی ختم نہیں کیا جاسکتا۔ نہ الکتاب کو ختم کیا جاسکتا ہے نہ حاملین کتاب کو، یہاں تک کہ ربّ کائنات اس دنیا کو لپیٹنے کا فیصلہ نہ کر لے۔

اس وقت ضرورت اس امر کی ہے کہ جن لوگوں نے اپنا تن من دھن اس دین کے غلبے (یعنی مجاہدین) کے لیے وقف کر دیا ہے، انہیں رہنمائی مہیا کی جائے۔ علمائے حق کی جانب سے ہو یا حق گو سپہ سالاروں کی طرف سے۔ پاکستان کے مخلص مسلمان دو انتہاؤں میں اپنے آپ کو پاتے ہیں۔ ایک طرف وہ مذہبی جنونی جو قرآن اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے بہرہ ہیں اور فتنہ پروروں (غیر ملکی و ملکی) کے اکسانے پر انتہائی اقدام کر گزرتے ہیں۔

دوسری جانب مغرب سے مرعوب (اور مراعات یافتہ) وہ بزدل دانشور ہیں جو منطق کی دلیلوں میں چالاک لیکن بیگانۂ اخلاص و مروّت ہیں۔

ملکی عساکر اور مجاہدین کی آویزش پہلے ہی نیٹو افواج کی منصوبہ بندی کا حصہ تھی جس نے تذبذب اور تشویش کو مزید مہمیز دی۔

اس اندھی جنگ میں غیر ملکی ایجنسیوں کے آسیب سے ملکی قوتوں کے خائف رہنے سے مزید انتشار میں اضافہ ہوا۔

ان سارے مسائل پر ٹھنڈے دل ودماغ سے غور کرنے کے بعد واپسی کا راستہ ڈھونڈا جائے۔ جہاد اور مجاہدین کو دوبارہ ان بنیادوں پر کھڑا کرنے کی ضرورت ہے جس کے الزام سے یہ سب کچھ ممکن ہوا۔ ملک کے طول وعرض سے ہزاروں کی تعداد میں جبری طور پر گمشدہ افراد کو باز یاب کروایا جائے جنہیں دہشت گردی کے ساتھ جنگ کے عنوان سے امریکی ایما پر ملکی تحفظ کے اداروں نے اغوا کیا۔ یہ انتہائی ظالمانہ بدترین اور سنگین ترین ظلم اس ملک میں پرویزی دور سے روا رکھا گیا ہے۔ اس مکروہ ظلم کا فوری خاتمہ ضروری ہے۔

نئی دینی تحریک انہی جبری گمشدہ افراد کی بازیابی کے ساتھ ہی شروع کی جاسکتی ہے جنہوں نے اپنی جوانی کے کئی سال اذیت کے کٹہروں اور اندھے عقد بت خانوں میں گزار دیے۔

جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تُو نے
وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

البرہان کا تبصرہ

ڈاکٹر انعام اللہ صاحب ہمارے پرانے مہربان ہیں اور کبھی کبھار البرہان میں لکھتے بھی ہیں۔ اپنے اس تازہ مضمون میں انہوں نے ایک تو علما پر تنقید کی ہے اور دوسرے جہاد کی اہمیت پر زور دیا ہے اور ان کی رائے ہے کہ ان دونوں موضوعات پر نئی دینی تحریک چلنی چاہیے۔

جو لوگ ساری خرابیوں کا ذمہ دار علماء کرام کو سمجھتے ہیں ہمیں ان کی رائے میں مبالغہ نظر آتا ہے؟ کیا ہمارے سیاسی اور عسکری حکمرانوں کا کوئی قصور نہیں ہے جو اغیار کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں؟ کیا میڈیا والوں کا کوئی قصور نہیں ہے جو دن رات فحاشی وعریانی پھیلاتے ہیں؟ کیا اساتذہ کا کوئی قصور نہیں ہے جو غلط تعلیم دیتے ہیں؟ کیا صوفیاء کا کوئی قصور نہیں ہے جو صحیح تزکیہ نہیں کرتے؟ مطلب یہ کہ طبقہ علماء میں خامیاں ہوں گی لیکن یہ کہنا کہ ساری خرابیوں کے ذمہ دار وہ ہیں، صحیح نہیں لگتا۔

چلیے ہم بحث کی خاطر فرض کر لیتے ہیں کہ ساری خرابیوں کے ذمہ دار علماء ہیں لیکن سوال یہ

ہے کہ ان پر تنقید کے تیر برسانا اور ان کی مذمت کرنا مسئلے کا کون سا حل ہے؟ کیا اس سے ان کی اصلاح ہو جائے گی؟ ڈاکٹر صاحب جیسے سمجھ دار آدمی کو اس بات پر غور ضرور کرنا چاہیے۔

ڈاکٹر انعام اللہ صاحب کی اس بات میں بھی وزن نہیں ہے کہ پاکستان کے علماء 'جہاد' کی حمایت نہ کرنے کے قصوروار ہیں۔ سوال یہ ہے کہ جہاد ہے کہاں اور جہادی ہیں کون؟ کیا طالبان پاکستان، القاعدہ اور داعش جہاد کر رہے ہیں؟ اب یہ بات ثابت ہو چکی کہ یہ تنظیمیں مغربی خفیہ ایجنسیوں کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہیں، تو ان کی حمایت کون کرے اور کیوں کرے؟

افغانستان میں طالبان کے غیر ملکیوں اور کفار کی مداخلت کے خلاف جہاد کی پاکستان کے سارے علماء نے حمایت کی اور عملاً بھی دینی جماعتوں اور اداروں نے اس میں حصہ لیا۔ اگر ڈاکٹر صاحب طالبانِ پاکستان کو صحیح جہادی سمجھتے ہیں تو ہمیں حیرت ہے اور ہمیں ان کی رائے سے اتفاق نہیں۔

علماء ماضی میں بھی پاکستان کی سیاسی و عسکری قیادت کی امریکی حمایت پر تنقید کرتے رہے ہیں اور آج بھی کرتے ہیں۔ ہماری ایجنسیاں اگر دینی لوگوں کو اٹھا لیتی ہیں (یعنی Missing Persons کا کیس) تو علماء اور دینی جماعتیں اس کے خلاف احتجاج کرتی رہی ہیں کہ وہی اس کا نشانہ بھی بنتی رہی ہیں لیکن ظاہر ہے اپنی عسا کر سے لڑا تو نہیں جا سکتا پر امن احتجاج ہی کیا جا سکتا ہے۔

ہاں! یہ اعتراض صحیح ہے کہ علماء کرام اور دینی جماعتوں نے متحد ہو کر اس کے خلاف تحریک نہیں چلائی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ بدقسمتی سے متحد نہیں ہیں۔ جب وہ نفاذ شریعت کے لیے متحد نہیں ہیں تو اور کس بات پر متحد ہوں گے؟ لیکن ڈاکٹر صاحب غور فرمائیں کہ علماء کرام اور ان کی جماعتوں کو اتحاد کی دعوت دینے کے سوا اس کا کوئی حل بھی ہے؟ کیا البرہان یہ کام نہیں کر رہا؟ کیا ملی مجلس شرعی یہ کام نہیں کر رہی؟ کیا ملی یکجہتی کونسل اس کے لیے آواز نہیں اٹھا رہی؟

اگر ڈاکٹر صاحب کہیں کہ اس کے لیے پرزور تحریک چلنی چاہیے جو اپنے مطالبے منوائے اور کامیاب ہو جائے، تو وہ ہماری رہنمائی فرمائیں کہ ہمارے معاشرے میں ایسی تحریک کون چلائے گا اور کون چلا سکتا ہے؟ خوش فکری، خوش فہمی اور ہوا میں گھوڑے دوڑانا الگ بات ہے، عمل کی دنیا میں آ کر زمینی حقائق کا سامنا کرنا دوسری بات ہے۔ امید ہے ڈاکٹر صاحب ہماری ان گزارشات پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۴)

مطالعۂ کتاب

ڈاکٹر انوار احمد بگوی[۱]

'اسلامی نظریاتی کونسل: ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی'

مرتبہ: ڈاکٹر حافظ اکرام الحق یٰسین

پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔ مسلم لیگ اور اس کی قیادت نے برصغیر کے مسلمانوں کو ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' کی عام دعوت دی تھی۔ چنانچہ مسلمانوں نے اسلام کے نام پر مسلم لیگ کو ووٹ دیا تھا تا کہ حاصل شدہ خطّہ زمین پر اسلام کی حاکمیت قائم اور قرآن حکیم کے احکام کی حکمرانی ہو۔ یہ وہ حقیقت عظمیٰ ہے جس کا موہوم ساخاکہ مسلمانوں کی فوز وفلاح کے لئے سب سے پہلے سرسید مرحوم نے پیش کیا جب انہوں نے ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو ایک علیحدہ قوم ہونے کا احساس دلایا تھا اور اپنے معاشی اور تعلیمی حق کے لئے جدوجہد کی دعوت دی تھی۔ علامہ محمد اقبال نے اسی تصور کو حکیمانہ بصیرت کے ساتھ آگے بڑھایا۔ اُن کے خطبات اور اشعار مسلمانوں اور مسلم لیگ کی قیادت کو مسلم قومیت اور اسلام کی حاکمیت کا شعور دیتے رہے۔

اقبال کی اس فکر نے جناح کو قائد اعظم بنا دیا۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی سیاسی جدوجہد اسی وقت کامیابی کی سمت تیز تر ہوئی جب انہوں نے اقبال کی فکری رہنمائی قبول کی اور مسلم قومیت کی شناخت کو اپنا ہدف متعین کر لیا۔ نظریۂ پاکستان کی تشکیل میں قائد اعظم مرحوم کے خطابات اور بیانات 1938ء سے 1948ء تک مسلسل اسلام کی اسی راہ کو روشن بناتے رہے جو اسلامیان ہند نے منتخب کر لی تھی۔ علامہ اقبال کی خواہش پر دارالسلام جمال پور (پٹھان کوٹ) میں قیام وطن سے پہلے اور قیام کے بعد جو پہلا سرکاری ادارہ قائم کیا گیا اس کا نام " ادارہ احیائے ملتِ اسلامیہ" تھا۔ اس ادارہ میں کلیدی شخصیت نومسلم عالم علامہ محمد اسد مرحوم کی تھی۔ دیگر اراکین میں ایس ایم انور، مولانا محمد جعفر شاہ پھلواری، سید نذیر نیازی، مولانا محمد حنیف ندوی وغیرہ شامل تھے۔ ادارے کا مقصد" زندگی کی اسلامی خطوط پر تعمیر نو کے لئے معاشرے کی مدد" کرنا تھا۔ اس ادارے نے علامہ محمد اسد مرحوم کے رسالے" عرفات" کو اپنا ترجمان بنالیا۔ پاکستان کی پہلی مجلس قانون ساز کے 87 اراکین میں سے 20 غیر مسلم تھے اور اُن میں ایک قادیانی مذہب کے جانثار

[۱] مصنف ودانشور، میڈیکل سپرنٹنڈنٹ/ چیف ایگزیکٹو، منصورہ ہسپتال ملتان روڈ لاہور

سر ظفر اللہ خان بھی شامل تھے۔ اس مقتدر مجلس نے اسلامی آئین اور اسلامی قوانین وضع کرنے تھے۔ اس پس منظر میں 12 مارچ 1949ء کو قرارداد مقاصد (Objectives Resolution) منظور ہوئی۔ یہ کام اگرچہ روز اول کو ہونا تھا لیکن قیام کے پونے دو سال بعد وجود میں آیا۔ تاخیر کے باوجود یہ درست سمت میں درست قدم تھا۔ اس کے بعد لادین عناصر کے لئے نظریہ پاکستان یعنی اسلام سے رجعت قہقری ممکن نہ رہی۔

آئین سازی کے ضمن میں بنیادی اُصولوں کی کمیٹی (Basic Principles Committee) نے 1949ء سے 1954ء تک کام کیا۔ اس کمیٹی نے قرارداد مقاصد کے مطابق دستور کے بنیادی اصولوں پر مشتمل ایک رپورٹ تیار کرنا تھی۔ اس بنیادی کام میں غیر معمولی تاخیر کی گئی جس سے اسلامی آئین سازی تعطل کا شکار ہوگئی۔ اس کمیٹی میں بھی قادیانی جماعت کے امام مرزا بشیر الدین محمود صاحب کے خاص مرید اور نمائندے سر ظفر اللہ خان بھی شامل تھے۔

پاکستان میں جو اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، وہاں اسلام کے ساتھ کیا گزری؟ عہد جدید میں یہ ایک طویل اور دلخراش داستان ہے۔ اسلامی آئین وقوانین اور اسلامی معاشرے کے لئے جدوجہد کرنے والوں کے لئے اس میں سبق آموز کہانیاں ہیں۔" اسلام بیتی" کے حوالے سے داستان کے کچھ حصے وفاقی ادارہ....اسلامی نظریاتی کونسل کے اندر مدفون ہیں۔ یہ سرکاری اور غیر سرکاری منابع سے کبھی تو سامنے آئیں گے۔

سرکاری سطح پر کونسل پر کیا گزری؟ اس کی کچھ تفصیل اور کچھ ان کہی باتیں زیر نظر رپورٹ میں موجود ہیں۔'' اسلامی نظریاتی کونسل۔ ادارہ جاتی پس منظر اور کارکردگی" کے نام سے 3 سو صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ ہے جسے کونسل ہی کے سیکرٹری ڈاکٹر حافظ اکرام الحق یسٰین نے تالیف کیا ہے۔ کتاب کے نو ابواب ہیں اور ہر باب میں متعدد فصول ہیں۔ ان میں فکری پس منظر، ابتدائی نظریاتی اقدامات، مجلس دستور ساز کے قائم کردہ نظریاتی ادارے، تشکیل دستور 1956ء، ایوبی دستور 1962ء اور بھٹو دور کے دستور 1973ء کے تحت قائم ہونے والے نظریاتی ادارے اسلامی نظریاتی کونسل کی تشکیل کے مختلف ادوار (پہلی سے بارھویں کونسل 2016ء تک) اور کونسل کی معاون سرگرمیوں اور کارکردگی کی سرکاری تفصیل مرتب کی گئی ہے۔ اس اعتبار سے بقول مولانا محمد خان شیرانی، سابق چیئرمین کونسل" یہ کتاب اسلامی نظریاتی کونسل کے تاریخی ارتقاء، قیام کے مراحل اور کارکردگی کے حوالے سے معلومات فراہم" کرتی ہے۔

رپورٹ کے ابتدائی حصوں پر قابل قدر محنت کی گئی ہے۔ کاغذ، طباعت بہت عمدہ، ارتقائی

مراحل کی تصاویر کی تعداد البتہ کم ہے۔شرکاء کے ناموں کے ساتھ مختصر تعارف بھی بہت تشنہ لگتا ہے بالخصوص مشرقی پاکستان کے اسلام دوست اراکین اسمبلی کے موثر رول کے حوالے سے۔

بورڈ آف تعلیماتِ اسلامیہ (1949ء۔1954ء) مولانا سید سلیمان ندوی کی صدارت میں قائم ہوا تھا تاکہ قرارداد مقاصد اور بنیادی اُصولوں کی کمیٹی کی جانب سے دستوری معاملات میں وقت کی سرکار کو مشاورت دے۔ 23۔21 جولائی 1953ء کو مولانا سید سلیمان ندوی ہی کی زیر صدارت 31۔علماء نے 22 دستوری نکات منظور کئے۔ یہ ایک غیر سرکاری کارِ عظیم تھا۔اس کام میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے تمام اسلامی مکاتب فکر کے نمایاں اصحاب شامل تھے۔

دراصل دستور سازی کے کام اور ملک کو اسلام کی سمت میں چلانے کی یہ ایک موثر کوشش تھی۔1953ء میں ایک ملک گیر تحریک تحفظ ختم نبوت برپا ہوئی جو حقیقت میں حکومت کے ان اقدامات کے خلاف تھی جو ملک کو اسلام کی راہ سے ہٹانے اور اسلامی نظام حیات کی منزل کو بتدریج دھندلانے کی حکومتی کوششوں کے خلاف تھی۔ بظاہر یہ تحریک قادیانی وزیر خارجہ کی اسلام دشمن ریشہ دوانیوں کی مخالفت میں تھی مگر اصل میں اس کے مطالبات اسلامی نظام کے قیام کے لئے بھی عوام اور علماء کا بھرپور احتجاج تھے۔اس کتاب میں ملکی تاریخ کے اس انتہائی شاندار اور نتیجہ خیز مذہبی باب کا اشارۃً بھی ذکر نہیں ہے۔

22 دستوری نکات تحریک ختم نبوت کے دوران منظر عام پر آئے جب تمام علماء یک آواز اور یک منبر ہوئے۔باب پنجم کی فصل دوم میں" دستور سازی میں علماء کا کردار" بہت سطحی اور مختصر بیان ہوا ہے، زمینی حقائق اس سے بہت مختلف ہیں۔بعض علماء خصوصاً مولانا امین احسن اصلاحی نے اسلامی آئین اور قوانین و معاشرہ کے لئے جامع تصانیف تحریر کی ہیں۔ اسلام، اسلامی دستور اور اسلامی معاشرہ کی بابت دیگر اہل علم کی قلمی اور تحریکی خدمات بے مثال ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ آئین کو اسلامی تشخص دینے اور پاکستانی معاشرے کو اسلامی بنانے میں علماء کا زبردست کردار رہے۔ درست کہ ان کی اکثریت نظریۂ پاکستان کے خلاف اور کانگریس کی ہم نوا تھی لیکن قیام وطن کے بعد علماء نے دین کے نام پر کوئی مداہنت یا کمزوری نہیں دکھائی۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ اسلام سے اعراض، اغماض اور ہر حال میں روگردانی و بہانہ سازی سے ہماری سیاسی تاریخ بھری پڑی ہے۔ کیسے ملک کی سیاسی قیادت، انگریز کی باقیات نوکر شاہی، عدلیہ، فوجی اقتدار اور غرض تمام حکمران اور حاکم طبقے اسلام کو بطور نعرہ اور ڈھال استعمال کرتے رہے لیکن اس

کے نفاذ میں کوئی بھی مخلص اور سنجیدہ نہ تھا۔ پاکستان قائم ہوا تو اقتدار اور اختیار اس طبقے کے پاس تھا جو ICS (انڈین سول سروس) کہلاتا تھا اور بعد میں CSP (سول سروسز آف پاکستان) کہلایا۔ ابتدائی عہد میں عدالت عظمیٰ اور عدالت عالیہ کے جج CSP/ICS کلاس سے آتے تھے۔ تحریک ختم نبوت کی انکوائری کمیشن کے دونوں سیکولر جج مسٹر محمد منیر اور مسٹر محمد رستم کیانی ICS تھے۔

ڈاکٹر حافظ اکرام الحق یاسین کی رپورٹ میں 1956ء، 1962ء اور 1973ء کے دساتیر کے تحت قائم ہونے والے، وفاقی سرکاری اداروں کا بیان ہے۔ ان تمام کونسلوں کے زمانہ قیام میں ہونے والے کاموں اور اجلاسوں کے نام موجود ہیں۔ زیادہ تفصیل میں ان کاموں کی فہرست ہے جو 11 سالہ ہمہ مقتدر جنرل اور صدر ضیاء الحق کے عہد میں وجود میں آئے۔

یہ امر ضرور قابل توجہ ہے کہ فاضل مرتب نے بانئ پاکستان کے بیانات کو اُن کے صحیح تناظر (PROSPECTIVE) میں پیش کیا ہے کہ وہ پاکستان کو ایک رفاہی اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ یہ اعتراف قابل تعریف اور تاریخ کی صحیح ترجمانی ہے۔

رپورٹ سے اندازہ ہوتا ہے کہ آئین، قوانین اور معاشرتی نظام حیات کو اسلامی بنانے کی کوششوں کی گاڑی مسلسل ہچکولوں اور پٹریوں کے بدلنے کا شکار رہی۔ پڑھنے میں تو کونسل اراکین اور چیئرمینوں میں بڑے بڑے عالم، فاضل نام ملتے ہیں لیکن طے کردہ منازل اور حاصل شدہ متاع کی مقدار اور معیار دونوں پر مایوسی ہوتی ہے۔ شاید ہمارے یہ اکابرین اور مشاہیر تفہیم، تدوین اور ترویج اسلام کے لئے حکمرانوں اور حاکموں کی خوشنودی کو ملحوظ رکھتے تھے۔

اسلامی نظریاتی کونسل ایک وفاقی وزارت اور اس کے سیکرٹری کے ماتحت کام کرتی ہے۔ یہی لوگ اصل میں ملک کے حاکم ہوتے ہیں۔ ان سیکرٹریوں کے نام بھی آنے چاہئیں تا کہ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے والوں میں یہ بھی سامنے رہیں۔

کونسل پر اب تک اٹھنے والے اخراجات (بجٹ) کا ذکر نہیں کیا گیا ورنہ حقیقت یہ ہے کہ وفاقی محکموں کی طرح یہ بھی ایک کثیر المصارف ادارہ ہے۔ ان اخراجات کے مقابلے میں ملک، قوم اور معاشرے کو حاصل ہونے والے نتائج کا تخمینہ بھی ابھی باقی ہے۔